قرآن وسنت اور اسلاف امت کی تعلیمات کا داعی
دینی، علمی، ادبی، تحقیقی اور اصلاحی مضامین کا حامل

مجلّہ صدائے حق بنگلور

سرپرست

حضرت مولانا محمد سلمان صاحب بجنوری زیدت معالیھم

استاذ حدیث ومدیر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند

مدیر

عبدالرزاق بنگلوری

نائب مدیر

مفتی عبدالرحمٰن بنگلوری

ناشر

مجلس، صدائے حق اسلامک پورٹل بنگلور-78

قرآن وسنت اور اسلافِ امت کی تعلیمات کا داعی

دینی، علمی، ادبی، تحقیقی اور اصلاحی مضامین کا حامل

مجلّہ

صدائے حق بنگلور

جلد:۰۴	شمارہ:۲	ماہ اگست ۲۰۲۳ء	ماہ محرم ۱۴۴۵ھ

سرپرست

حضرت مولانا محمد سلمان صاحب بجنوری دامت برکاتہم

استاذِ حدیث و مدیر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند

مدیر	نائب مدیر
عبدالرزاق بنگلوری	مفتی عبدالرحمٰن صاحب بنگلوری

مجلس ادارت

- مفتی محمد علی صاحب قاسمی
- مولانا محمد اُویس صاحب رشادی
- مولانا عبداللطیف صاحب قاسمی

مجلسِ مشاورت

- مولانا اشرف صاحب قاسمی
- مولانا عبدالقدوس صاحب مظاہری
- مفتی عبدالفتاح صاحب قاسمی

ADVERTISEMENT TARIFF

Full Page (Title Back Cover)	6000/-
Full Page (Title Inner Cover)	5000/-

Black and White

Full Page (Inside Pages)	2000/-
Half Page (Inside Pages)	1000/-
Cuarter Page (Inside Pages)	500/-

Phone Pe & Google Pay:7406464533

مضمون نگار کی آرا سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں

شائع کردہ

مجلس: صدائے حق اسلامک پورٹل بنگلور 78

فہرست مضامین

عناوین	مضامین	اسمائے محررین	صفحہ نمبر
اداریہ	ایثار و ہمدردی اور انسانیت کا سبق	عبدالرزاق بنگلوری	۳
درسِ حدیث	والدین کے ساتھ حسنِ سلوک	مفتی عبدالرحمٰن صاحب بنگلوری	۵
اصلاحِ معاشرہ	موجودہ حالات میں مسلمان کیا کریں؟	حضرت مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی	۱۰
// // //	قانونِ شریعت اور انسانی قانون کے درمیان بنیادی فرق	مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی	۱۵
// // //	پڑوسی کو تکلیف پہنچانا	مفتی محمد عفان صاحب منصور پوری	۲۲
// // //	قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلمان!	مولانا محمد عمرین محفوظ رحمانی صاحب	۳۲
// // //	قلب کو اخلاقِ محمودہ سے مزین کرنے کا بیان (قسط چہارم)	مفتی محمد سلطان خان صاحب قاسمی	۳۴
// // //	مسلمان کے ساتھ خیر خواہی	مفتی عبداللطیف صاحب قاسمی	۴۰
مقالات	حضرت اقدس مولانا خلیل احمد سہارنپوری قدس سرہٗ کے علوم ومعارف	مولانا محمد اویس صاحب رشادی	۴۹
تعزیت نامہ	تعزیت نامہ	از مرتب	۵۳

اطلاعِ عام

نوٹ: مضمون نگار اپنے مضامین مندرجہ ذیل ای میل (E-mail) یا واٹسیپ (WhatsApp) پر ان پیج (InPage) فائل روانہ کرسکتے ہیں، جزاکم اللہ خیراً وأحسن الجزاء.

Email: muftiabdurrahman57@gmail.com
Whatsapp No: 09620795460 - 9739349433

اداریہ

ایثار و ہمدردی اور انسانیت کا سبق

از: عبدالرزاق بنگلوری

دنیا میں نہ تو ہر انسان بڑا ہوتا ہے اور نہ ہی ہر انسان اچھا ہوتا ہے، اِس پوری دنیا میں اچھے اور بُرے دونوں طرح کے لوگوں کا توازن ہے۔ آج کے اِس دَور میں جیسے تہذیب وتمدن بالکل مٹا جارہا ہے، خونی رشتے ایک دوسرے کا خون بہارہے ہیں، ثقافت کی بربادی ہورہی ہے، رحم دل، ایمان، مذہب ان سب کا نام ونشان مٹا جارہا ہے، آج کے دَور کا انسان صرف اپنے بارے میں سوچ رہا ہے، اپنے فائدے کے لیے انسان گناہ پر گناہ کرتا جارہا ہے، انسانیت رحم دلی، ہمدردی اور اخلاقیت کا نام ہے، انسان ہونا ہمارا انتخاب نہیں؛ بلکہ قدرت کی عطا ہے؛ لیکن اپنے اندر انسانیت بنائے رکھنا ہمارا انتخاب ہے اور جو حالات ہمارے ملک ہندوستان میں روز افزوں رونما ہورہے ہیں، وہ قابلِ مذمت اور نا قابلِ تذکرہ ہیں؛ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر انسانیت کو شرمسار کرنے والے حالات ہیں، ابھی حال میں جو R.P.F کے ایک جوان نے اپنے سینئر سمیت تین مسلمانوں کو شہید کردیا اور اس کے علاوہ جو مسلسل منی پور میں انسانیت کے خون کے ساتھ کھیلا جارہا ہے اور اس پر حکومتِ ہند نے بھی خاموشی اختیار کی ہوئی ہے، یہ گویا کہ دھیرے دھیرے انسانوں کے اندر سے انسانیت ختم کرنے والے اعمال ہیں، انسان صرف انسانیت کی وجہ سے پہچانا جاتا ہے، جب اس کے اندر سے انسانیت ختم ہوجائے تو جانوروں سے بھی بدتر ہوجاتا ہے۔

حقیقتِ انسانی:

انسان کو مختلف دانشور اور فلسفی مختلف انداز میں بیان کرتے ہیں، انسان اور دیگر جانوروں میں بنیادی فرق شعور اور ذہن کا ہے، انسان سب ایک جیسے ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک جیسا بنایا ہے، سب کے اوصاف بھی ایک جیسے ہیں، افکار ونظریات میں قدرے فرق ہوتا ہے۔

تہذیب وتمدن کی ابتداء میں انسان اس بات کو نظر انداز کرتا تھا: اور وہ اپنی طاقت اور قوت کے زور پر ایک دوسرے کو مار دینے کیخواہش رکھتا تھا، نتیجہ یہ نکلتا تھا کہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس، یعنی طاقتور خود کو کمزور بالاتر تصور کرتا تھا اور اس طرح لوگوں کو غلام بنانے کے تصور نے بھی اس دنیا میں جنم لیا۔

الغرض جب بھی کبھی انسانیت طبقات اور ذات پات میں تقسیم ہونے لگی، انسانی کردار اور روپئے فنا ہونے لگے، تب اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے خاص اور ہدایت یافتہ بندوں کو انسانوں کی فلاح و بہبود کے لیے بھیجا، اللہ تعالیٰ کے ان مقرب ومحترم پاکیزہ نفوس نے بھی انسانوں کو اس بات کی تعلیم دی کہ انسان ایک ہیں، ایک جیسے ہیں اور انہیں ایک دوسرے سے مثبت برتاؤ رکھنا چاہیے۔

جس طرح انسان نے یہ درس دیا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ایک ہے، اسی طرح اسلام کی تعلیمات میں یہ بھی ہے کہ سارے انسان مٹی سے پیدا کیے گئے، ان میں نہ گورے کو کالے پر فضیلت ہے اور نہ عربی وعجمی کو ایک دوسرے پر فضیلت ہے، قرآنِ حکیم انسانی اقدار کے دروس سے بھرا ہوا ہے، قرآنِ کریم میں سورۂ لقمان میں بھی اللہ تعالیٰ نے حضرت لقمان علیہ السلام کے قصہ کا ذکر فرمایا، جنھوں نے اپنے فرزند کو شرک، غرور سے بچنے اور انسانیت کا درس دیا۔

انسانیت تب قائم رہ سکتی ہے جب ہم ایک دوسرے کو اپنے برابر کا انسان تصور کریں گے، اپنے دل سے اپنے دوسرے بھائی کے لیے بعض حسد اور نفرت کو باہر نکال پھینکیں گے اور ایک دوسرے کے جذبات اور احساسات کا احترام کریں گے، نفرت، حقارت، غرور اور تکبر انسان کے سب سے بڑے دشمن ہیں، یہ چیزیں انسانی تقسیم کا باعث ہیں، اس سے یہ ہوتا ہے کہ ایک طبقہ کو دنیا کی تمام سہولیات میسر آتی ہیں، تو دوسرا شخص روٹی کے ایک نوالے کو ترستا ہے، اسی وجہ سے اگلے پہر انتشار بھی جنم لینے لگتا ہے اور تمام انبیاء، علماء اور صوفیاء نے بھی انسانوں کے بُرے افعال اور اعمال سے بچانے کی کوشش کی ہے، کوئی بھی سچا مذہب نفرت کا درس نہیں دیتا، نفرت مذہبی تعلیم نہیں؛ بلکہ ایک قسم کا تکبر اور حسد ہے، اسلام نے بھی ہمیں مذہبی رواداری کا درس دیا ہے۔

ہمیں بھی چاہیے کہ ہم کسی کا حق ضبط نہ کریں، کسی پر ظلم نہ کریں، کسی انسان کو خود سے کمتر نہ سمجھیں اور اپنے اندر ایثار والے اوصاف پیدا کریں، اسی میں ہماری آنے والی نسلوں اور قوم کی حفاظت اور شادمانی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمارے درمیان سے نفرت کو ختم کر کے ایثار و ہمدردی پیدا کرے، آمین۔

❑❖❑

درسِ حدیث

والدین کے ساتھ حسنِ سلوک

ازقلم: مفتی عبدالرحمٰن صاحب بنگلوری، ناظم مدرسہ دارالتوحید، اعلیٰ ہلی بنگلور

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: ''رِضَا الرَّبِّ فِيْ رِضَا الْوَالِدِ وَسَخَطُ الرَّبِّ فِيْ سَخَطِ الْوَالِدِ''.

(جامع الترمذی: ۱۲/۲)

عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''رب کی رضا والد کی رضا میں ہے اور رب کی ناراضگی والد کی ناراضگی میں ہے۔

تشریح:

اِس حدیث سے معلوم ہوا کہ والدین کو راضی رکھنا ضروری ہے، اور انہیں ناراض کرنا سخت گناہ کی بات ہے؛ کیوں کہ ان کی رضا میں اللہ کی رضا اور ان کی ناراضگی میں اللہ کی ناراضگی ہے۔

ربِّ ذوالجلال نے اپنے حق کی ادائیگی کے بعد فی الفور ماں باپ کا تذکرہ فرمایا ہے، اِس سے ماں باپ کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، ارشادِ باری ہے:

﴿اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ، اِلَيَّ الْمَصِيْرُ ○﴾

(پ:۲۱، سورۂ لقمان، رکوع:۲، رقم الآیۃ:۱٤)

کہ حق مان میرا اور اپنے ماں باپ کا، آخر مجھی تک آنا ہے۔ (شیخ الہندؒ)

تشریح:

یعنی ماں کا حق باپ سے بھی زیادہ ہے، وہ مہینوں تک اس کا بوجھ پیٹ میں اُٹھائے پھری، پھر وضعِ حمل کے بعد دو برس تک دودھ پلایا، اس دَوران میں نہ معلوم کیسی کیسی تکلیفیں اور سختیاں جھیل کر بچہ کی تربیت کی، اپنے آرام کو اُس کے آرام پر قربان کیا؛ لہٰذا ضروری ہے کہ آدمی اوّلاً خدا تعالیٰ کا اور ثانیاً اپنے ماں باپ کا، خصوصاً ماں کا حق پہچانے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے اور ماں باپ کی خدمت واطاعت میں بقدرِ استطاعت مشغول رہے، جہاں تک ہوسکے اللہ کی نافرمانی نہ ہو؛ کیوں کہ اُس کا حق سب سے مقدم ہے اور اُسی کے سامنے سب کو حاضر ہونا ہے، انسان دل میں سوچ لے کہ کیا منھ لے کر وہاں جائے گا۔ (فوائدِ عثمانیؒ)

دوسری جگہ مزید وضاحت کے ساتھ ربِّ ذوالجلال نے اس حکم کو تاکیداً بیان فرمایا ہے، ملاحظہ ہو:

﴿وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا، اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَا اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَا اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ○ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ○﴾ (پ:١٥، سورۂ بنی إسرائیل رکوع:٣، رقم الآیة: ٢٣-٢٤)

﴿اور حکم کر چکا تیرا رب کہ نہ پوجو اُس کے سوائے اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرو﴾ (خدا حقیقتاً بچہ کو وجود عطا فرماتا ہے، والدین اُس کی ایجاد کا ظاہری ذریعہ ہیں؛ اِس لیے کئی آیتوں میں خدا تعالیٰ کے حقوق کے ساتھ والدین کے حقوق ذکر کیے گئے ہیں۔ حدیث میں آیا ہے کہ: ''وہ شخص خاک میں مل گیا جس نے اپنے والدین کو پایا اور اُن کی خدمت کر کے جنت حاصل نہ کی''، ایک حدیث میں فرمایا کہ: ''جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے''، والدین کے ساتھ بھلائی کرنا یہ ہے کہ زندگی میں اُن کی جان و مال سے خدمت اور دل سے تعظیم و محبت کرے، مرنے کے بعد اُن کا جنازہ پڑھے، ان کے لیے دعاء و استغفار کرے، اُن کے عہد تا مقدور پورے کرے، ان کے دوستوں کے ساتھ تعظیم و حسنِ سلوک سے اور اُن کے اقارب کے ساتھ صلۂ رحمی سے پیش آئے وغیر ذٰلک)۔

﴿اگر پہنچ جائے تیرے سامنے بُڑھاپے کو ایک اُن میں سے یا دونوں، تو نہ کہہ اُن کو 'ہُوں' اور نہ جھڑک اُن کو اور کہہ اُن سے بات ادب کی﴾ (بُڑھاپے میں خدمت کی احتیاج زیادہ ہوتی ہے، جس سے بعض اقات اہل وعیال بھی اُکتانے لگتے یں، زیادہ پیرانہ سالی میں ہوش وحواس بھی ٹھکانے نہیں رہتے، بڑی سعادت مند اولاد کا کام ہے کہ اُس وقت بُڈھے والدین کی خدمت گزاری وفرماں برداری سے جی نہ ہارے، قرآن نے تنبیہ کی کہ جھڑکنا اور ڈانٹنا تو کجا، اُن کے مقابلہ میں زبان سے ''ہُوں'' بھی مت کرو؛ بلکہ بات کرتے وقت پورے ادب وتعظیم کو ملحوظ رکھو۔ ابنِ مسیّبؒ نے فرمایا: ایسی طرح بات کرو جیسے خطاوار غلام سخت مزاج آقا سے کرتا ہے) ﴿اور جھکا دے اُن کے آگے کندھے، عاجزی کر نیازمندی سے اور کہہ اے رب! ان پر رحم کر جیسا پالا اِنہوں نے مجھ کو چھوٹا سا﴾ (یعنی جب میں بالکل کمزور و ناتواں تھا انہوں نے میری تربیت میں خون پسینہ ایک کر دیا، اپنے خیال کے موافق میرے لیے ہر ایک راحت وخوبی کی فکر کی، ہزار ہا آفات وحوادث سے بچانے کی کوشش کرتے رہے، بار ہا میری خاطر اپنی جان جوکھوں میں ڈالی، آج ان کی ضعیفی کا وقت آیا ہے جو کچھ میری قدرت میں ہے اُن کی خدمت وتعظیم کرتا ہوں؛ لیکن پورا حق ادا نہیں کر سکتا؛ اِس لیے تجھ سے درخواست کرتا ہوں کہ اس بُڑھاپے میں اور موت کے بعد ان پر نظرِ رحمت فرما)۔ (شیخ الہندؒ مع فوائدِ عثمانیؒ)

اولاد پر ماں کے حقوق:

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ، قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَنْ أَحَقُّ بِحُسْنِ صَحَابَتِيْ؟ قَالَ: أُمُّكَ، قَالَ: ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ: أُمُّكَ، قَالَ: ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ: أُمُّكَ، قَالَ: ثُمَّ مَنْ: قَالَ: أَبُوْكَ. وَفِيْ رِوَايَةٍ: قَالَ أُمُّكَ، ثُمَّ أُمُّكَ، ثُمَّ أُمُّكَ، ثُمَّ أَبَاكَ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے عرض کیا: ''یارسول اللہؐ! میری اچھی رفاقت (یعنی میری طرف سے حسنِ سلوک واحسان اور خدمت گزاری) کا سب سے زیادہ مستحق کون شخص ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تمہاری ماں''، اُس نے عرض کیا کہ پھر کون؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تمہاری ماں''، اُس نے عرض کیا کہ پھر کون؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تمہاری ماں''، اس نے عرض کیا کہ پھر کون؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تمہارا باپ''۔ ایک روایت میں یوں ہے کہ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (اُس شخص کے سوال کے جواب میں) فرمایا کہ: ''پھر تمہاری ماں، پھر تمہاری ماں، پھر تمہاری ماں، پھر تمہارا باپ، پھر تمہارا وہ عزیز جو نزدیک کی قرابت رکھتا ہو''۔

تشریح:

اِس دنیا کے معاشرہ کی کامیابی و درستگی اصل میں باہمی حقوق کی نگہداشت، تعلق وقرابت کی پاسداری، ایک دوسرے کے ساتھ حسنِ سلوک اور احسان و بھلائی کے برتاؤ اور اس حُسنِ سلوک میں فرقِ مراتب کے احساس پر منحصر ہے، شریعتِ اسلامی کا تقاضا ہے کہ انسان اس دنیا میں ایک دوسرے کے ساتھ جس تعلق وقرابت کا رشتہ رکھتا ہے اور اس تعلق وقرابت میں جو فرقِ مراتب ہے ادائیگیِ حقوق اور حسنِ سلوک کے باہمی معاملات میں اُس کا لحاظ ضروری ہے، ظاہر ہے کہ قرابت کے اعتبار سے ماں کا رشتہ سب سے زیادہ گہرا اور اُس کا تعلق سب سے زیادہ قریب ہوتا ہے؛ لہٰذا کسی شخص کے احسان وحسنِ سلوک اور خدمت گزاری کی سب سے زیادہ مستحق جو ذات ہوسکتی ہے وہ ماں ہے، ماں کے بعد باپ ہے اور پھر دوسرے قرابتی اور رشتہ دار؛ لیکن ان قرابتی اور رشتہ داروں میں بھی تعلق وقرابت کے درجات ومراتب کی رعایت کی جائے گی کہ جو رشتہ دار، اپنے رشتہ کے اعتبار سے جتنا زیادہ نزدیک اور قریب ہوگا وہ اتنا ہی زیادہ مقدم رکھا جائے گا، مذکورہ حدیث میں اسی ضابطہ کو بیان کیا گیا ہے۔

بعض علماء نے اس حدیث کے الفاظ سے ایک مسئلہ یہ اخذ کیا ہے کہ کسی شخص پر والدین کے ساتھ حُسنِ سلوک اور بھلائی کرنے کے جو حقوق عائد ہوتے ہیں اُن میں ماں کا حصہ باپ سے تین گنا بڑھا ہوا ہے؛ کیوں کہ وہ حمل کا بوجھ اٹھاتی ہے، ولادت کی تکلیف ومشقت اور دودھ پلانے کی محنت برداشت کرتی ہے۔

فقہ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ اولاد پر ماں کا حق باپ کے حق سے بڑا ہے اور اُس کے ساتھ حُسنِ سلوک وبھلائی اور اس کی خدمت ودیکھ بھال کرنا زیادہ واجب اور زیادہ ضروری ہے اور اگر ایسی صورت پیش آجائے جس میں بیک وقت دونوں کے حقوق کی ادائیگی دشوار ہوجائے، مثلاً ماں باپ کے درمیان کسی وجہ سے اَن بَن ہو اور لڑکا اگر ماں کے حقوق کی رعایت کرتا ہے تو باپ ناراض ہوتا ہے اور اگر باپ کے حقوق کا لحاظ کرتا ہے تو ماں آزردہ ہوتی ہے، تو ایسی صورت میں یہ درمیانی راہ نکالی جائے کہ تعظیم واحترام میں تو باپ کے حقوق کو فوقیت دے اور خدمت گزاری؛ نیز مالی امداد وعطا میں ماں کے حق کو فوقیت دے۔

ماں باپ کے حقوق کی فہرست بہت طویل ہے؛ بلکہ اُن کے مرتبہ ودرجہ کو دیکھا جائے تو حقیقت یہ ہے کہ اولاد اگر اپنی پوری زندگی بھی ان کے حقوق کی ادائیگی میں صَرف کردے تب بھی اُن کے تئیں اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتی، تاہم شریعت نے کچھ چیزیں ایسی بیان کردی ہیں جو زیادہ اہمیت کی ہیں اور جن کا لحاظ ہر صورت ہونا چاہیے، مثلاً: سب سے پہلی چیز تو یہ ہے کہ ان کی جائز خواہشات کی تکمیل اور ان کی اطاعت وفرمانبرداری کو لازم جانا جائے اور ان کی رضا وخوشنودی کو اپنے حق میں ایک بڑی سعادت سمجھی جائے، اپنی حیثیت واستطاعت کے مطابق ان کی ضروریات اور اُن کے آرام وراحت میں اپنا مال واسباب خرچ کیا جائے اور ان کے ساتھ ایسا سلوک کیا جائے جو ان کی شان کے مطابق ہو، اولاد ان کے سامنے تواضع وانکساری اختیار کرے، اُن کے سامنے ملائمت ونرمی اور خوشامد وعاجزی کا رویہ اپنائے اور جہاں تک ہوسکے اُن کی خدمت کرے، تاآنکہ وہ راضی اور خوش ہوں، ان کی اطاعت وفرمانبرداری میں کوئی کوتاہی نہیں کرنی چاہیے؛ لیکن اطاعت وفرمانبرداری ان ہی اُمور میں کی جانی چاہیے جو مباح ہوں، اُن کے ساتھ کوئی ایسا رویہ نہیں اپنانا چاہیے جس سے اُن کی شان میں بے ادبی وگستاخی ظاہر ہوتی ہو اور نہ اُن کے ساتھ تکبر وانانیت کے ساتھ پیش آنا چاہیے، خواہ وہ مشرک ہی کیوں نہ ہوں، بات چیت کے وقت اپنی آواز کو اُن کی آواز سے اُونچی نہ کرنا چاہیے، اور نہ ان کا نام لے کر ان کو یاد ومخاطب کرنا چاہیے، کسی کام میں اُن سے پہل نہ کرنا چاہیے، اور نہ اُن کے مقابلہ پر خود کو نمایاں کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، اِسی طرح اس بات کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ اگر والدین غیر شرعی اُمور کے مرتکب ہوں تو اُن کے سامنے امر بالمعرف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کی ادائیگی کے وقت بھی ادب واحترام اور

نرمی وملائمت کی راہ اختیار کی جائے اور ایک دفعہ کہنے پر وہ باز نہ آئیں تو پھر سکوت اختیار کرلیا جائے اور ان کے حق میں دعاء واستغفار کرتے رہنا چاہیے۔

ایک روایت میں ہیکہ: ایک آدمی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے جہاد کی اجازت مانگی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: تمہارے ماں باپ زندہ ہیں؟ اُس نے کہا جی ہاں! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو انہیں میں جہاد کر (یعنی اُن کی خدمت کر کے اُن کا دل جیت لے)۔

مذکورہ بالا روایات وآیات سے والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کی تعلیم ملتی ہے، اللہ تعالیٰ ہم تمام کو والدین کی قدر دانی کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

اصلاحِ معاشرہ

موجودہ حالات میں مسلمان کیا کریں؟

از: نمونۂ اسلاف حضرت مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی
مہتمم وشیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند

اِس وقت ملک کے جوتشویش ناک حالات ہیں وہ سب کے سامنے ہیں، ہرشعور رکھنے والا جانتا ہے کہ مسلمان، اسلام اور اسلامی شعائر کے خلاف دن بہ دن دائرہ تنگ کیا جارہا ہے، حالات نازک سے نازک تر ہوتے جارہے ہیں، پہلے بھی فسادات ہوتے تھے، کچھ دکانیں جل جاتی تھیں، کچھ مکانات میں آگ لگ جاتی تھی، کچھ لوگ جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے تھے، پھر آہستہ آہستہ زخم مندمل ہوجاتے تھے؛ لیکن اب شرعی احکام اور شعائرِ اسلام پر حملے ہورہے ہیں، اسلامی حجاب پر، نمازِ جمعہ کھلے میں ادا کرنے پر اور لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ اذان دینے پر پابندی عائد کی جارہی ہے؛ نیز اس طرح کے کئی ایک مسائل (جن کا اسلامی تشخص سے تعلق ہے) برابر اُٹھائے جارہے ہیں اور ماحول کو زیادہ سے زیادہ زہریلا اور گندہ کرنے کی کوشش ہورہی ہے۔

ابھی حالیہ دنوں میں "The Kashmir File" کے نام سے کشمیری پنڈتوں سے متعلق ایک فلم بنائی گئی اور پورے ملک میں دکھائی گئی، جس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کے خلاف غیرمسلموں کے دلوں میں نفرت کا جذبہ پیدا ہو، وہ اشتعال میں آئیں اور انتقامی کارروائی کے لیے انھیں اُبھارا جائے۔

ناموافق حالات مسلسل آرہے ہیں اور ایسا نہیں ہے کہ لوگوں کو اس کا علم وادراک نہیں، سب جانتے ہیں؛ مگر اس کے مقابلے کے لیے تیار نہیں۔ جو لوگ دانشور کہلاتے ہیں یا اپنے کو فکرمند ظاہر کرتے ہیں وہ سوائے قائدین کو کوسنے اور سوشل میڈیا پر زبانی جمع خرچ کے کچھ نہیں کررہے ہیں، عام مسلمانوں کو اِس موقع پر کیا کرنا چاہیے؟ یہ بات کسی کی طرف سے سامنے نہیں آرہی ہے، آج میں یہی بات عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اِن حالات میں ہماری کیا ذمہ داری بنتی ہے اور ہم سب کو کیا کرنا چاہیے؟ میرے خیال میں تین کام ہیں جو اِس وقت ہمارے کرنے کے ہیں، میں سب سے پہلے اپنے آپ سے مخاطب ہوں، پھر اپنے اہلِ خانہ ومتعلقین سے، پھر اہلِ محلّہ واہلِ شہر سے اور پورے ملک کے لوگوں سے جہاں تک یہ آواز پہونچ سکتی ہے۔

پہلا کام:

سب سے پہلی چیز اپنے ایمان کو مضبوط کریں اور اعمال واخلاق کو درست کریں، اللہ جل شانہٗ ارشاد فرماتے ہیں: تم کمزور مت پڑو اور رنجیدہ مت ہو، تم ہی سر بلند رہوگے بشرطیکہ تم ایمان والے ہو، یعنی ایمان تمہارے اندر مضبوط ہو اور ایمان کے تقاضوں پر عمل کرتے ہو تو یقینی طور پر تمہیں کامیابی اور سر بلندی ملے گی۔ یاد رکھیں! یہ اللہ کا جو اعلان ہے وہ ہمیشہ کے لیے ہے، تم ہرگز اللہ کے طریقہ میں کوئی تبدیلی نہیں پاؤ گے، اللہ کے فیصلہ میں کوئی ردوبدل نہیں ہوگا، جو ضابطہ ہے وہ ہمیشہ کے لیے ہے۔

لہٰذا سب سے پہلا کام تو یہ ہے کہ کمزور نہ پڑیں، بزدل نہ بنیں، دل کے اندر ایمانی قوت پیدا کریں، موت ایک مرتبہ آنی ہے اور وقتِ مقرر پر آنی ہے، یہ ہمارا عقیدہ ہے، اِس کا استحضار رکھیں۔

موت کا ایک دن معین ہے:

ایمان کی بنیادی چیزوں میں یہ بات شامل ہے کہ جب بندہ پیدا ہوتا ہے تو اللہ کی طرف سے اپنی عمر متعین کرواکے آتا ہے۔ (الاعراف:۳۴) جب مرنے کا متعین وقت آجاتا ہے تو بندہ نہ ایک لمحہ آگے جاسکتا ہے اور نہ ایک لمحہ پیچھے آسکتا ہے۔ قرآنِ مجید کے مطابق آدمی اگر مضبوط قلعوں کے اندر بھی چھپ کر بیٹھے گا تو موت وہاں پہونچ کر رہے گی؛ اِس لیے موت تو آنی ہے، ہر ایک کو آنی ہے، اپنے وقت پر آنی ہے اور صرف ایک مرتبہ آنی ہے؛ لہٰذا موت کے خوف سے آدمی کا ہر وقت ڈرتے رہنا اور اپنے دل کو کمزور کرنا یہ ایمانی قوت کے بالکل خلاف ہے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا حال تو یہ تھا کہ ان کو میدانِ جنگ میں برچھی لگتی تو وہ کہتے: ’’فُزْتُ وَرَبِّ الْکَعْبَۃِ‘‘ (خدا کی قسم! میں تو کامیاب ہوگیا)؛ اِس لیے دل کو مضبوط رکھیں اور جو کام کرنے کے ہیں اُنہیں کرتے رہیں، ایمان کو طاقت ور بنانے کے ساتھ ساتھ اعمال کی اصلاح کریں، اخلاق کو درست کریں، جلوت اور خلوت کی زندگی کو تقویٰ والی زندگی بنائیں، اللہ کی نافرمانی سے اپنے آپ کو بچائیں، رمضان ہو کہ غیر رمضان؛ نمازوں کا اہتمام سو فیصد ہو، دیگر اسلامی احکامات پر مکمل عمل پیرا رہیں، اسی طرح جو ہماری اخلاقی کمزوریاں اور خرابیاں ہیں اُن سے خود بھی رُکیں اور توبہ کریں، ساتھ ہی ساتھ اپنے گھر والوں، بچوں، عورتوں اور جوانوں کو اُن سے روکیں، ماحول سے خرابیوں کو مٹانے کی کوشش کریں۔

اِس لیے کہ اللہ کی مدد تقویٰ اور صبر کے ساتھ مشروط ہے: جو آدمی تقویٰ اختیار کرتا ہے، اللہ سے ڈرتا ہے اور دین پر جم جاتا ہے، اللہ تعالیٰ اُس کی مدد فرماتے ہیں اور اس کے اجر کو ضائع نہیں فرماتے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم

کی اِسی تقویٰ اور صبر کی بنیاد پر مدد ہوئی ہے؛ لہٰذا ہم بھی اپنے ایمان کو بنائیں، اعمال کو درست کریں اور اخلاق کو سنوارنے کی فکر کریں۔

دوسرا کام:

دوسری چیز یہ ہے کہ اپنے عمل کے ذریعہ اسلام کا سچا پیغام لوگوں تک پہنچائیں؛ اِس لیے کہ ایک تصویر تو اسلام اور مسلمانوں کی وہ ہے جو دوسروں کی طرف سے دنیا والوں کے ذہن میں بٹھائی جارہی ہے کہ یہ متشدد ہیں، دہشت گرد ہیں، بداخلاق ہیں، قاتل ہیں، خونی ہیں وغیرہ اور ایک اسلام اور مسلمانوں کی حقیقی تصویر ہے، جو ہمیں اسلام نے سکھائی ہے، جو اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بتائی ہے، جس پر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم قائم تھے، یعنی ہم امن پسند ہیں، غریبوں، مسکینوں اور پڑوسیوں کے مددگار ہیں، انسانیت کی بنیاد پر ایک دوسرے کی خبر گیری اور ہم دردی کرنے والے ہیں، ہماری ذمہ داری ہے کہ اپنے عمل کے ذریعہ اِس کو ثابت کریں اور یہ بھی ذہن میں رکھیں! اَغیار کی غلط تشہیروں، فرضی فلموں اور بے بنیاد پروپیگنڈوں کے ذریعہ مسلمانوں کے تشدد پسند، دہشت گرد اور خوں خوار ہونے کا جو تصور بٹھایا جارہا ہے، یہ صرف تقاریر و بیانات سے ختم نہیں ہوگا؛ بلکہ عمل کے ذریعہ اِس کا ازالہ کرنا ہوگا۔

اُن کا جو فرض ہے وہ اہلِ سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

ہمیں محبت کا پیغام عام کرنا چاہیے، محبت کا پیغام پہونچانا چاہیے اور محبتوں کو بانٹنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ہمیں ہرگز دوسروں پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیے، جو حالات چل رہے ہیں، ہم دیکھ رہے ہیں، نہ کوئی سیاسی پارٹی اِن کے خلاف آواز اُٹھا رہی ہے، نہ کوئی سیاسی لیڈر کھل کر سامنے آرہا ہے، ہمیں جو کچھ کرنا ہے اپنے زورِ بازو اور قوتِ ایمانی کی بنیاد پر کرنا ہے؛ اِس لیے اپنے اعمال و اخلاق کو درست کریں اور دل کے اندر ہمت پیدا کریں۔ اب رہا یہ سوال کہ حالات کی بناء پر جو دل میں کمزوری آرہی ہے، ذہن میں جو خوف بیٹھا ہوا ہے، عجیب طرح کی دہشت طاری ہے، اِس کی کیا وجہ ہے؟ اور یہ کیسے دُور ہوگی؟

ہماری بے وزنی کا اصل سبب:

اِس موقع پر ایک حدیث یاد آئی، جو پہلے سے آپ کے علم میں ہوگی اور آپ بارہا سن چکے ہوں گے، وہ حدیث آج کے حالات پر مِن وعَن صادق آرہی ہے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اشاد فرمایا (ترجمہ): قریب ہے کہ

دیگر قومیں تم پر ایسے ہی ٹوٹ پڑیں، جیسے کھانے والے پیالوں پر ٹوٹ پڑتے ہیں، (آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان سن کر) ایک کہنے والے نے کہا: کیا ہم اُس وقت تعداد میں کم ہوں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں! بلکہ تم اُس وقت بہت ہوگے؛ لیکن تم سیلاب کے جھاگ کی طرح (بے وقعت) ہوگے، اللہ تعالیٰ تمہارے دشمن کے سینوں سے تمہارا خوف نکال دے گا اور تمہارے دلوں میں ''وہن'' ڈال دے گا، ایک کہنے والے نے کہا: اللہ کے رسول! وہن کیا چیز ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ دنیا کی محبت اور موت کا ڈر ہے۔ (ابوداؤد)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس وقت یہ پیش گوئی فرمائی تھی، اُس وقت صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی شوکت تھی، قوت تھی، دبدبہ تھا، ایک مہینے کے فاصلہ تک اُن کا رعب پہونچا ہوا تھا؛ اِس لیے وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد سن کر تعجب سے کہنے لگے: کیا اُس وقت ہم لوگ تعداد کے اعتبار سے بہت تھوڑے ہوں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں! تم لوگ اُس وقت تعداد میں بہت ہوگے؛ لیکن تمہاری حیثیت وہ ہوگی جو سیلاب کے زمانے میں پانی کی سطح پر بہنے والے کوڑے کرکٹ اور جھاڑ جھنکاڑ کی ہوتی ہے، نہ اُن کی کوئی قدر و قیمت ہوتی ہے، نہ اُن کے اندر کوئی طاقت وقوت ہوتی ہے، وہ بہاؤ سے اپنے آپ کو نہیں روک سکتے، وہ اپنے وجود کو باقی نہیں رکھ سکتے، پانی کا بہاؤ جدھر لیے جارہا ہے بہتے چلے جارہے ہیں، کہیں کوئی چیز آ گئی ٹکرا گئے، نشیب آیا تو نیچے گر گئے، بالکل اِسی طرح تم بے وقعت ہوجاؤ گے۔

مزید فرمایا: اللہ تعالیٰ تمہارے دشمنوں کے دلوں سے تمہارا رعب نکال دے گا اور تمہارے دلوں میں کمزوری پیدا کردے گا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا کہ یہ بزدلی کہاں سے آئے گی اور کیوں آئیگی؟؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایاء اِس کے دو سبب ہوں گے: دنیا کی محبت اور موت کی کراہیت۔ یہ دو اسباب ہیں جو بزدلی لانے والے اور دل میں کمزوری پیدا کرنے والے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ جو اسباب کمزوری اور بزدلی لانے والے ہیں اُن کا علاج یہ ہے کہ اُن کو ختم کیا جائے اور اُنہیں ہٹانے کی کوشش کیجائے۔

دنیا کی محبت کیا ہے؟

دنیا کی محبت یہ ہے کہ ہم آخرت کی زندگی سے غافل ہوجائیں اور دنیا کی فانی لذتوں کے اسیر بن جائیں۔ یہ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ آج نیند ہمیں پیاری ہے، نماز پیاری نہیں، ہم سود لے رہے ہیں، جھوٹ بول رہے ہیں، بے ایمانی کررہے ہیں، وعدہ خلافی کررہے ہیں، خیانت کررہے ہیں، وارثوں کا حق ماررہے ہیں، پڑوسیوں کو تکلیف پہنچارہے ہیں، بے ایمانی کررہے ہیں اور یہ سب کام چار پیسے کی خاطر، تھوڑی سی لذت اور

تھوڑی سی راحت کی خاطر کیے جارہے ہیں، یہی حب الدنیا ہے؛ جس کے ہوتے ہوئے اللہ کی مدد نہیں آسکتی۔ ایک مقام پر ارشادِ باری ہے: ترجمہ: اے پیغمبر! مسلمانوں سے کہہ دو کہ: اگر تمہارے باپ، تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں، تمہارا خاندان اور وہ مال ودولت جو تم نے کمایا ہے اور وہ کاروبار جس کے مَندا ہونے کا تمہیں اندیشہ ہے اور وہ رہائشی مکان جو تمہیں پسند ہیں، تمہیں اللہ اور اُس کے رسول سے اور اُس کے راستے میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں، تو انتظار کرو، یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ صادر فرمادے اور اللہ نافرمان لوگوں کو منزل تک نہیں پہنچاتا۔

یاد رکھیں! صرف فریاد کرنے اور حالات کا شکوہ کرنے سے کچھ نہیں ہوگا، اپنے اندر قوت پیدا کریں اور جن راستوں سے یہ کمزوری آرہی ہے اُن کو ختم کرنے کی کوشش کریں۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں ایمان واعمال کی بنیاد پر فیصلے کیے جاتے ہیں اور ایمان والوں کے امتحانات بھی ہوتے ہیں، ہم جانتے ہیں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم پر حالات آئے، غزوۂ اُحد میں حالات آئے، غزوۂ حنین میں حالات آئے اور صرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی پر نہیں، پچھلے انبیاءِ کرام علیہم السلام پر بھی حالات آئے؛ جن کا قرآن میں تذکرہ کیا گیا کہ انھیں جھنجھوڑ کر رکھ دیا گیا، یہاں تک کہ رسول اور اُن کے امتی کہنے لگے: آخر اللہ کی مدد کب آئے گی، اللہ فرماتے ہیں: سنو! اللہ کی مدد قریب ہے۔

اخیر میں پھر کہوں گا کہ موت آئے تو عزت کے ساتھ آئے؛ لیکن دلوں میں بزدلی اور کمزوری بٹھا کر اپنے کو دوسروں کے سپرد کردینا، ایمان والے کی شان نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو صحیح سمجھ عطا فرمائے اور صحیح طور پر عمل کرنے کی توفیق بخشے، آمین۔

❑❖❑

اصلاحِ معاشرہ

قانونِ شریعت

اور انسانی قانون کے درمیان بنیادی فرق

ازقلم: فقیہ العصر حضرت مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی، صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

''مؤرخہ ۳۰/۳۱/جولائی ۲۰۲۳ء کو اسلامک فقہ اکیڈمی دہلی کے کانفرنس ہال میں ایک منفرد نوعیت کا پروگرام منعقد ہوا، جس میں ہندوستان بھر سے ان وکلاء یا وکالت کی تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کو جمع کیا گیا، جو دینی مدارس کے فارغین ہیں، اور ان کا دوروزہ تربیتی پروگرام رکھا گیا، جس میں مربی کی حیثیت سے زیادہ تر سپریم کورٹ کے وکلاء کا خطاب ہوا، راقم الحروف نے اس موقع سے زبانی صدارتی خطبہ پیش کیا اور حاضرین کی خواہش پر اس کا موضوع ''الہامی قانون اور وضعی قانون کے درمیان فرق'' رکھا گیا، جو موجودہ حالات میں جب کہ قانونِ شریعت کو فرسودہ قرار دیا جارہا ہے، اس میں تبدیلی کی بات کہی جارہی ہے اور ملک میں UCC کے لیے فضا ہموار کی جارہی ہے، قانون سے تعلق رکھنے والے اساتذہ، طلبہ اور اہلِ دانش کے لیے خصوصی اہمیت کا حامل ہے؛ اس لیے اس زبانی اور برجستہ خطاب کا خلاصہ یہاں پیش کیا جارہا ہے۔'' (رحمانی)

قانونِ شریعت اور دوسرے قوانین کے درمیان تین بنیادی فرق ہیں: پہلا فرق یہ ہے کہ قانونِ شریعت میں قانون کا ماخذ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، دوسرے قوانین میں خود انسان کی عقل یا خواہش کو قانون کا سرچشمہ مانا گیا ہے، دوسرا فرق یہ ہے کہ قانونِ شریعت انسانی فطرت پر مبنی ہے نہ کہ انسانی خواہش پر، اور مروجہ قوانین کی بنیاد انسانی خواہش پر ہے، تیسرا فرق یہ ہے کہ شریعت میں اصل اہمیت عدل کی ہے، یعنی تمام طبقات کے ساتھ انصاف کیا جائے، کبھی مساوات اور برابری عدل کا تقاضا ہوتا ہے، اس وقت برابری بھی ضروری ہوگی، اور کبھی عدل کا تقاضا ہوتا ہے کہ تمام لوگوں پر برابری کے ساتھ اس کا اطلاق نہیں کیا جائے؛ بلکہ فرق کے ساتھ اس کو نافذ کیا جائے، ایسے موقع پر شریعت مساوات کے بجائے عدل کا راستہ اختیار کرتی ہے۔

ان میں سے پہلے نکتہ کی تفصیل یہ ہے کہ: قرآنِ مجید نے بار بار کہا ہے کہ انسانی زندگی کے مسائل کے بارے میں فیصلہ کرنا اللہ تعالیٰ ہی کا حق ہے: ﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ﴾ (انعام:۵۷) جو فیصلہ اللہ تعالیٰ نے کر دیا ہے، وہ سچائی اور انصاف پر مبنی ہے، اب اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی، ﴿وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا لَامُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ﴾ (انعام:۱۱۵) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مشرکینِ مکہ نے مطالبہ کیا تھا کہ آپ اس قرآن کے بجائے کوئی دوسرا قرآن لے آئیں، یا اس میں کچھ تبدیلیاں کر دیجیے، اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کی زبانِ مبارک سے کہلوایا کہ خود مجھ کو بھی اس میں کسی تبدیلی کا حق نہیں ہے ﴿قُلْ مَايَكُوْنُ لِيْ أَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآءِ نَفْسِيْ﴾ (یونس:۱۵)

اسی لیے شریعت کا اوّلین ماخذ ''کتاب اللہ'' اور ''سنتِ رسول'' ہے، جو حکم قرآنِ مجید میں ایسے واضح الفاظ میں آیا ہو کہ اُس میں کسی دوسرے معنیٰ کا احتمال نہ ہو، یا ایسی معتبر حدیث میں آیا ہو جس کے ثابت ہونے میں کوئی شک نہیں ہو، وہ قطعی ہے، اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی؛ البتہ جس حکم کی بنیاد کسی خاص زمانہ کی مصلحت پر ہو، جو بعد میں بدل گئی ہو، تو اس حکم میں بدلاؤ ہوسکتا ہے، یا جو حکم کسی خاص زمانہ کے عرف اور رواج کی وجہ سے دیا گیا ہو اور وہ عرف بدل گیا ہو، یا جس حکم کی قرآن وحدیث میں صراحت نہ ہو اور وہ اجتہادی مسئلہ ہو، جس میں شریعت کے مزاج کو سامنے رکھ کر غور وفکر کر کے کوئی رائے قائم کی گئی ہو تو ایسے احکام میں امت کے فقہاء اجتماعی اجتہاد کے ذریعہ کوئی تبدیلی کر سکتے ہیں؛ مگر یہ حقیقت میں تبدیلی نہیں ہوگی؛ بلکہ دو مفاہیم میں سے ایک کو ترجیح دینا اور اپنے زمانے کے لحاظ سے شریعت کے حکم کو منطبق کرنا ہوگا، اس کی بہت سی مثالیں فقہ کی کتابوں میں موجود ہیں، جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی چیز کو اپنے قبضہ میں لینے سے پہلے اس کو آگے بیچنے سے منع فرمایا۔ (بخاری، حدیث نمبر:۲۱۲۳) ابتدائی دَور میں کسی چیز کو قبضہ میں لینے کا ایک ہی مفہوم تھا اور وہ تھا اُس چیز کو محسوس طور پر اپنے قبضہ میں لے لینا؛ لیکن پھر ایسی چیزیں وجود میں آئیں کہ جن کا فیزیکل قبضہ دشوار تھا، تو قبضہ کی حقیقت متعین کرنے میں معنوی قبضہ کو بھی شامل کیا گیا، یہاں تک کہ موجودہ دَور میں جب کہ شیئر کی بڑے پیمانہ پر خرید و فروخت ہوتی ہے اور سوائے اس کے کہ خریدار کے اکاؤنٹ میں خریدے ہوئے شیئر کی مقدار درج ہو جاتی ہے، سامان پر قبضہ کی کوئی اور علامت نہیں ہوتی ہے، تو موجودہ دَور کے اہلِ علم نے رِسک (Risk) کی منتقلی کو قبضہ کے لیے کافی قرار دیا، یعنی جب شیئر خریدار کے اکاؤنٹ میں منتقل ہو جائے اور قیمت بڑھنے کا فائدہ اور قیمت گرنے کا نقصان اُس کو برداشت کرنا پڑے تو سمجھا جائے گا کہ قبضہ کا تحقّق ہو گیا، یہ دراصل حکم میں تبدیلی نہیں ہے؛ بلکہ کسی حکم کو منطبق کرنے میں بدلے ہوئے طریقۂ کار کو قبول کرنا ہے۔

اِس کے برخلاف دنیا کے مروجہ قوانین میں قانون کا سرچشمہ انسان کو قرار دیا گیا ہے، کہیں مطلق العنان بادشاہ یا ڈکٹیٹر کے حکم کو قانون مانا جاتا ہے، کہیں جمہور یعنی اکثریت کے فیصلے سے قانون بنتا ہے، کہیں عوام کے منتخب نمائندوں کے ذریعہ قانون بنایا جاتا ہے، ان تمام صورتوں میں انسان کو حق دیا گیا ہے کہ وہ خود اپنے لیے قانون بنائے؛ اس لیے انسان اپنی خواہش کی بنیاد پر قانون بناتا بھی ہے اور بدلتا بھی ہے، قرآنِ مجید نے کہا کہ قانون کی بنیاد محض انسانی خواہشات کو نہیں بنایا جاسکتا ﴿وَلَاتَتَّبِعْ اَھْوَآءَ ھُمْ﴾ (شوریٰ:۱۵) یہ بات قرآنِ مجید میں متعدد مقامات میں کہی گئی ہے۔ (نساء:۱۳۵، ۲۶)

اب غور کرنے کی بات یہ ہے کہ ان دونوں میں سے کون سا نقطۂ نظر زیادہ درست ہے؟ غور کیا جائے تو قانون بنانے والی اَتھارٹی کے لیے دو باتیں ضروری ہیں: ایک یہ کہ وہ جن لوگوں کے لیے قانون بنا رہا ہے، وہ ان کی مصلحتوں اور مضرتوں سے پوری طرح واقف ہو، اور ان کے نفع وضرر کا مکمل علم رکھتا ہو، دوسرے: وہ ان تمام لوگوں کے ساتھ انصاف کرسکتا ہو، وہ کسی ایک گروہ کی طرف جھکاؤ کا شکار نہ ہو؛ ورنہ وہ تمام لوگوں کے درمیان انصاف سے کام نہیں لے سکتا، وہ اکثریت کے مفاد کو مقدم رکھنے کی کوشش کرے گا، اپنے ہم نسلوں کے فائدہ کو سامنے رکھے گا اور دوسروں کو نظر انداز کرے گا، علم وعدل کا یہ کمال کائنات کے خالق کے اندر ہی ہوسکتا ہے؛ کیوں کہ جب اس نے انسان کو اور اس کے گرد بچھی ہوئی کائنات کو پیدا کیا ہے تو یقینی طور پر وہ اس بات سے واقف ہوگا کہ انسان کے لیے کون سی چیز اور کون سا عمل فائدہ مند ہوگا اور اس کے بالمقابل کون سی چیز اور کون سا عمل نقصان دہ ہوگا، اسی طرح تمام انسان اس کے بندے ہیں اور بندہ ہونے کی نسبت میں سب برابر ہیں؛ اس لیے کائنات کے خالق کے بارے میں اِس بات کا یقین کیا جاسکتا ہے کہ اس کا حکم عدل وانصاف پر، تمام لوگوں کی مصلحت وضرورت کی رعایت پر اور غیر جانبداری پر مبنی ہوگا، اگر قانون کی لگام ایک شخص کے ہاتھ میں دے دی جائے تو اس سے ہٹلر اور مسولینی جیسے فرمانروا پیدا ہوں گے، اور اگر ملک کے اکثریتی طبقہ کے ہاتھ میں قانون سازی کی لگام دے دی جائے تو اس سے بھی زیادہ نقصان دہ ہوگا؛ کیوں کہ ایک فرد ہی نہیں؛ بلکہ ملک کی بہت بڑی تعداد ڈکٹیٹر بن کر کھڑی ہوجائے گی اور وہ اقلیتوں کو پیس ڈالے گی، جس کی واضح مثال اس وقت اسرائیل میں دیکھی جاسکتی ہے، اور جس کے نقشِ قدم پر بدقسمتی سے ہمارا وطن عزیز بھی آگے بڑھ رہا ہے، جہاں فوج، عدالت، انتظامیہ یہاں تک کہ میڈیا سبھوں کو حکومت نے اپنے پنجۂ استبداد میں لے لیا ہے۔

اس لیے اسلام کا تصور یہ ہے کہ قانون بنانے کا اصل حق کائنات کے خالق ومالک کو ہے، اُس کو اپنے بندوں میں سے ایک ایک سے پیار ہے، وہ اپنی مخلوقات میں سے ایک ایک سے محبت رکھتا ہے، اس کی محبت ستر

ماؤں سے بڑھ کر ہے اور اس کا علم ایسا ہے کہ کائنات کی کوئی چیز اس کی نگاہ سے مخفی نہیں ہے، اور اس کی خاص صفت انصاف ہے، اس نے اپنی کتاب میں بار بار اپنی صفتِ عدل کا ذکر کیا ہے؛ اس لیے جہاں اللہ کا حکم موجود ہو چاہے وہ قرآنِ مجید میں ہو یا حدیث میں، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے منشا خداوندی کی ترجمانی ہے، وہاں وہی انسان کے لیے درست راہِ عمل ہے، ہاں جو احکام قرآن وحدیث میں موجود نہ ہوں؛ بلکہ فقہاء کے اجتہاد اور کسی خاص عہد کی مصلحت پر مبنی ہوں، ان میں گنجائش ہے کہ احوال کی تبدیلی کی وجہ سے حکم میں بھی تبدیلی کی جائے۔

اسلامی قانون کا دوسرا امتیاز یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی فطرت پر مبنی ہے؛ چناں چہ قرآنِ مجید نے اسلام کو قانونِ فطرت کا ترجمان قرار دیا ہے ﴿فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا﴾ (روم:۳۰) اور کہا ہے کہ شیطان لوگوں کو فطرت سے بغاوت پر اُکساتا رہتا ہے ﴿وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَیُغَیِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ﴾ (نساء:۱۱۹) اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ نظامِ فطرت پر قائم رہنے میں انسان کی بھلائی ہے اور نظامِ فطرت سے ہٹ جانے میں انسان کا نقصان ہے، اللہ تعالیٰ نے جسم کو صاف کرنے اور ٹھنڈا کرنے کے لیے پانی پیدا کیا ہے، اور کسی چیز کو گرم کرنے اور پکانے کے لیے آگ پیدا کی ہے، اب اگر کوئی شخص آگ میں نہانے لگے اور ٹھنڈے پانی پر پکانے لگے تو کیا وہ اپنے مقصد کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوگا؟

افسوس کہ مغربی دنیا علم وٹکنالوجی میں چاند ومریخ پر کمندیں ڈال رہی ہے اور اس نے ایسے ہتھیار بنالیے ہیں کہ وہ لمحوں میں پورے پورے ملک کو تباہ کر سکتے ہیں؛ لیکن وہ اپنی شہوات اور خواہشات کے سامنے اتنے کمزور ہیں کہ ایک چیز کو نقصان دہ جان کر بھی اس کو انجام دیتی ہے؛ کیوں کہ نفس اس کا تقاضا کرتا ہے، پوری میڈیکل دنیا اِس بات پر متفق ہے کہ شراب اور نشہ آور اشیاء انسان کے لیے بے حد نقصان دہ اور طرح طرح کی بیماریوں کا سبب ہیں، اس سے کینسر پیدا ہوتا ہے، انسان کے جسمانی قویٰ متأثر ہوتے ہیں، عمر گھٹ جاتی ہے، نشہ کی حالت میں قوتِ فیصلہ ختم ہوجاتی ہے، جو بات ہوش وحواس کی حالت میں انسان زبان پر لانا بھی گوارا نہیں کرتا، وہی باتیں وہ نشہ کی حالت میں بے تکلف اور برسرِ عام چیخ چیخ کر بولتا رہتا ہے، بوڑھوں، عورتوں، بچوں اور دوستوں پر ہاتھ اُٹھانے اور ان کو گالی گلوچ کرنے سے بھی گریز نہیں کرتا ہے، کتنے ہی قتل اور زنا بالجبر کے واقعات نشہ کی وجہ سے پیش آتے ہیں؛ اسی لیے قرآنِ مجید میں بھی اور توریت میں بھی نشہ کو حرام قرار دیا گیا؛ لیکن شراب سے ہزار نقصانات اور ان نقصانات کے اعتراف کے باوجود آج مغربی ملکوں اور ان تمام ملکوں میں شراب کی کھلی اجازت ہے، جہاں قانون کی لگام انسانوں کے ہاتھ میں ہے۔

انسانی سماج میں ہمیشہ سے یہ بات تسلیم کی جاتی رہی ہے کہ جنسی تعلق کا صحیح طریقہ یہی ہے کہ وہ مرد اور عورت یعنی شوہر اور بیوی کے درمیان رشتہ سے پوری کی جائے، اسی سے نسلِ انسانی کی افزائش متعلق ہے؛ لیکن موجودہ دَور میں مغرب کے شہوت پرست معاشرہ نے اِس بات کا مطالبہ کیا کہ مرد وعورت میں سے ہر ایک کو اپنی ہی جنس سے صنفی خواہش پوری کرنے کی اجازت دی جائے اور حکومتوں نے اس کے سامنے اپنا سر جھکا دیا، یہاں تک کہ اگر کوئی اس کی مخالفت کرتا ہے تو وہ معتوب ٹھہرایا جاتا ہے، اسی طرح ہمیشہ سے انسانی سماج اس بات کو تسلیم کرتا رہا ہے کہ جسم کا ایک خاص حصہ مَردوں کی صنفی خواہش کی تکمیل کے لیے ہے، اور وہ عورت کے بدن کے سامنے کا حصہ ہے، جسم کا پچھلا حصہ انسان کی دوسری جسمانی ضروریات پوری کرنے کے لیے ہے؛ لیکن جب انسان فطرت کا باغی بن جاتا ہے تو شہوت پرستی کی ساری سرحدیں ٹوٹ جاتی ہیں، مغرب میں اس کو بھی درست قرار دینے کا مطالبہ کیا گیا اور بیشتر ملکوں نے اسے تسلیم کرلیا اور اب تو ایسے بدقماش لوگوں کو اپنے اس گناہ کو ظاہر کرنے میں بھی کوئی عار نہیں۔

اسلام کسی بھی ایسے عمل کو قبول نہیں کرتا، جو فطرت کے خلاف ہو، چاہے سارے لوگ مل کر اس کو جائز قرار دینے کی کوشش کریں، انسانی زندگی کے تمام شعبوں سے متعلق شریعت کی تعلیمات میں یہ اصول کارفرما ہے، مثلاً اسلام نے تجارت کرکے اور کاروبار میں پارٹنر بن کر نفع حاصل کرنے کی اجازت دی ہے؛ لیکن سود اور جوا کی اجازت نہیں دی؛ کیوں کہ سود میں یہ بات فرض کرلی جاتی ہے کہ مال میں خود بخود بڑھنے کی صلاحیت ہے؛ اس لیے اگر کوئی شخص قرض حاصل کرے تو اس کو لازماً اس پر سود ادا کرنا چاہیے، یہ بالکل فطرت کے خلاف ہے، اگر آپ اپنے سوٹ کیس میں ایک لاکھ روپئے رکھیں اور ایک سال بعد سوٹ کیس کھولیں تو ایک لاکھ روپیہ ہی نکلے گا، ایک لاکھ دس ہزار نہیں ہوجائے گا؛ اس لیے اگر آپ کسی کو ایک لاکھ روپیہ اس معاہدہ پر دیں کہ وہ تجارت کرے اور سرمایہ کار کو نفع ونقصان میں شریک رکھے، نفع حاصل ہو تو نفع دے اور نقصان ہو تو نقصان برداشت کرنے میں بھی وہ شریک ہو، تو یہ تو عینِ فطرت کے مطابق ہوگا؛ لیکن یہ بات کہ آپ اس رقم کو اپنی تجارت میں استعمال کریں یا نہ کریں، ہمیں بہرحال اتنا فیصد نفع دے دیں، ظاہر ہے کہ کاروبار کی فطرت کے خلاف ہے۔

غرض کہ شریعتِ اسلامی اور انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین میں دوسرا اہم فرق یہ ہے کہ شریعت کا قانون فطرت کے تابع ہوتا ہے، انسان کی خواہشات کے تابع نہیں ہوتا، اور انسان جب قانون بنانے کو بیٹھتا ہے تو بہت سی دفعہ فطرت کے خلاف تقاضوں کو قبول کرلیتا ہے، چاہے وہ آخرت ہی میں نہیں دنیا میں بھی انسان کے لیے بے حد نقصان دہ اور تباہ کن ہو۔

تیسرا بنیادی فرق اسلامی شریعت اور مغربی تصور قانون (جس کی اِس دَور میں پوری دنیا پر حکمرانی ہے) کے درمیان یہ ہے کہ اسلام بنیادی طور پر عدل کا قائل ہے نہ کہ مساوات کا، ہاں جہاں مساوات اور برابری عدل کے تقاضہ میں شامل ہو، وہاں مساوات اور برابری کا بھی حکم دیتا ہے؛ اسی لیے قرآن مجید میں فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے۔ (نحل:۹۰) اور قرآنِ مجید میں مختلف انداز پر ۲۹ رجگہ عدل وانصاف کی تلقین کی گئی ہے، اشتراکی دنیا نے مالک اور مزدور کے درمیان برابری کا اور معاشی مساوات کا نعرہ لگایا تھا، جو فطرت کے خلاف تھا؛ اس لیے وہ چل نہیں سکا اور جس خطہ میں اس تصور کی پیدائش ہوئی تھی، وہیں ستر سال کے اندر ہی اس کی تدفین بھی عمل میں آ گئی، اسی طرح مغربی دنیا مرد وعورت کے درمیان مساوات کا نعرہ لگاتی ہے اور اس کو اپنی ترقی پسندی کی معراج سمجھتی ہے، اگر عورت کو ایک ہی شوہر پر اکتفا کرنا ہے تو مرد کو بھی ایک سے زیادہ شادی کی اجازت نہیں ہونی چاہیے، اور اگر مرد کو اس کی اجازت دی جاتی ہے تو عورت کو بھی ایک سے زیادہ مَردوں سے تعلق کی اجازت ہونی چاہیے، رشتۂ نکاح کو ختم کرنے کا اختیار مرد وعورت دونوں کو برابر ہونا چاہیے، ترکہ کی تقسیم میں بیٹا اور بیٹی کا حصہ برابر ہونا چاہیے، مرد ہی کی طرح عورت کو کسبِ معاش کی مکمل اجازت ہونی چاہیے، اگر مرد پر پردہ کی پابندی نہیں ہے تو عورت پر کیوں؟ یہاں تک کہ اب بعض مغربی ملکوں میں مطالبہ کیا جارہا ہے کہ اگر عوامی مقامات پر مَردوں کو سینہ کھلا رکھنے کی اجازت ہے تو عورتوں کو سینہ چھپا کر رکھنے کی پابندی کیوں؟ اسی تصور کی پیداوار لیو ان ریلیشن شپ (Liv in Relationship)، یعنی بغیر نکاح کے جسمانی تعلق، تعلیم وملازمت، کھیل اور سفر ہر جگہ اختلاط کی اجازت ہے۔

کوئی بھی شخص غیر جانبداری کے ساتھ مساوات اور برابری کے اس تماشہ کو دیکھے گا تو وہ محسوس کرے گا کہ یہ انسانیت کے لیے گمراہ کن اور خاص کر عورتوں کے لیے بہت بڑا دھوکہ ہے، اس تصور مساوات نے خاندانی نظام کے تار وپود بکھیر دیے، عورت کو سامانِ تجارت اور ذریعۂ تشہیر بنا دیا، عورت کی عزت وآبرو جس طرح اس تصور کے زیر اثر پامال ہورہی ہے، شاید ہی تاریخِ انسانی میں کبھی ایسا ہوا ہو، اگر حقیقت پسندی کے ساتھ غور کیا جائے تو کائنات کے بنانے والے نے اپنی اس دنیا کو مساوات کے اصول پر نہیں بنایا ہے، اس نے بہت سی چیزوں میں یقیناً مساوات رکھی ہے؛ مگر زیادہ تر تفاوت کے ساتھ چیزیں پیدا کی ہیں، ہر انسان کو دو ہاتھ، دو پاؤں، دو کان اور دو آنکھیں ضرور دی گئی ہیں؛ لیکن جسمانی قویٰ، دماغی صلاحیت، گویائی اور اظہار کی قدرت، اور بہت سی چیزوں میں ان کے درمیان فرق بھی رکھا گیا ہے، اسی طرح مرد وعورت کے درمیان یقیناً بہت سی چیزوں میں یکسانیت ہے؛ لیکن اس سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا کہ ان میں بہت سی جہتوں سے فرق بھی پایا جاتا ہے، جس کا قدم قدم

پر اظہار ہوتا ہے، ان کو نظر انداز کر دینا خود عورت کے ساتھ بھی ظلم ہوگا اور یہ بات فطرت کے بھی خلاف ہوگی، اگر کوئی شخص مساوات کے اصول پر اپنے دس سال کے بچے اور بیس سال کے لڑکے کو ایک خوراک دے تو کیا یہ مفید اور منصفانہ عمل ہوسکتا ہے؟ اگر دس سال کے بچے پچیس سال کے جوان اور ساٹھ سال کے بوڑھے کو ایک برابر وزن اٹھانے کا مکلّف کیا جائے تو کیا اس میں کوئی معقولیت ہوسکتی ہے؟

اسلام کا تصور یہ ہے کہ ہر انسان کی طاقت اور صلاحیت کے اعتبار سے اس کی ذمہ داریاں ہوں اور ذمہداریوں کے لحاظ سے اس کے حقوق ہوں، مثلاً خاندانی زندگی میں بیٹی کے مقابلہ بیٹے کی ذمہ داریاں زیادہ ہیں، اپنی کفالت، اپنے بچوں کی کفالت، بیوی کی کفالت، بوڑھے ماں باپ کی کفالت، بیوی کا مہر اور قریب قریب تمام ہی مالی ذمہ داریاں بیٹے یا مرد پر رکھی گئی ہیں، عورت پر کوئی مالی ذمہ داری نہیں رکھی گئی ہے، اب اگر مساوات پر عمل کیا جائے تو دونوں کا حصہ برابر ہونا چاہیے اور عدل وانصاف کو ملحوظ رکھا جائے تو بیٹا کا حصہ بہ مقابلہ بیٹی کے زیادہ ہونا چاہیے، شریعت نے اسی دوسرے پہلو کو ملحوظ رکھا ہے، اس حقیقت کو نظر انداز کرنے کی وجہ سے بعض لوگوں کو غلط فہمی پیدا ہوتی ہے اور ان کو لگتا ہے کہ اس میں لڑکی کے ساتھ ناانصافی کی گئی ہے۔

ایک مرد خود اپنی حفاظت کرسکتا ہے اور اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی کا مقابلہ کرسکتا ہے؛ لیکن ایک لڑکی اپنی جسمانی صلاحیت کے لحاظ سے اکثر اوقات ایسا نہیں کر پاتی اور اس کو کسی مرد کی طرف سے تحفظ کی ضرورت پڑتی ہے؛ اسی لیے شریعت نے پردہ تو مرد وعورت دونوں کے لیے رکھا؛ لیکن عورت کے لیے اس کی مقدار زیادہ رکھی، گھر سے باہر نکلنے کی اجازت حسبِ ضرورت دونوں کو دی؛ لیکن عورت کے لیے شرط رکھی گئی کہ طویل سفر میں بطور محافظ اس کا شوہر یا کوئی مرد محرم رشتہ دار ساتھ رہے، ظاہر ہے کہ نہ اس میں عورتوں کی تحقیر ہے اور نہ ان کے ساتھ زیادتی؛ بلکہ ان کی زائد اور خصوصی رعایت ہے۔

یہ چند وہ بنیادی فرق ہیں، جو اللہ کے بھیجے ہوئے قانون اور انسان کے بنائے ہوئے قانون کے درمیان نمایاں طور پر محسوس کیے جاسکتے ہیں، اور جن کو سامنے رکھ کر اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اسلام انسانی سماج کو زندگی گزارنے کا کتنا بہترین، مصلحت سے ہم آہنگ اور فطری نظامِ حیات دیتا ہے اور اس کے مقابلہ مغرب نے جو نعرہ لگایا ہے، وہ کس درجہ کھوکھلا اور بے وزن ہے۔

❑❖❑

اصلاحِ معاشرہ

پڑوسی کو تکلیف پہنچانا

ازقلم: حضرت مولانا مفتی سیّد محمد عفان صاحب منصور پوری (صدر المدرسین جامعہ اسلامیہ عربیہ جامع مسجد، امروہہ)

يقول أبو هريرةؓ قيل للنبي صلي الله عليه وسلم: يارسول الله! إن فلانة تقوم الليل وتصوم النهار وتفعل وتصدق وتؤذى جيرانها بلسانها؟ فقال: "لاخيرفيها، هي من أهل النار" قالو!: وفلانة تصلي المكتوبة، وتصدق باثوار ولاتؤذي أحدا؟ فقال رسول الله صلي الله عليه وسلم "هي من أهل الجنة" (أخرجه البيهقي في شعب الإيمان رقم: ٩٠٩٨ والبخاري فى الأدب المفرد، رقم:١١٩)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ارشاد فرماتے ہیں کہ: پیغمبر علیہ الصلاۃ والسلام سے پوچھا گیا کہ یارسول اللہ! ایک خاتون ہے جو راتوں کو نمازیں پڑھتی ہے، دن میں روزے رکھتی ہے، بہت سے اچھے کام کرتی ہے اور صدقہ وخیرات بھی کرتی ہے؛ لیکن اپنی زبان سے پڑوس میں رہنے والوں کو تکلیف بھی پہنچاتی ہے، آپ اس کے بارے میں کیا ارشاد فرماتے ہیں؟ اس کی عاقبت کیسی ہوگی؟ اُس کا انجام کیا ہوگا؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اس میں کوئی بھلائی باقی نہیں رہ گئی، وہ تو جہنمیوں میں سے ہے (اس روایت سے یہ پتا چلا کہ پڑوسیوں کو تکلیف پہنچانا، اذیت دینا ایسی بدعملی ہے جو انسان کی نیکیوں کو بھی بہالے جاتی ہے، اس کی اچھائیوں اور اعمالِ صالحہ کا بھی جنازہ نکال دیتی ہے) پھر سوال کیا گیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی عورت کے متعلق جو فرائض وواجبات تو ادا کرتی ہے؛ لیکن نفلی کام زیادہ نہیں کرتی، نہ زیادہ نمازیں پڑھتی ہے، نہ زیادہ روزے رکھتی ہے اور نہ ہی زیادہ صدقہ وخیرات کرتی ہے؛ البتہ وہ اپنی ذات سے کسی کو تکلیف نہیں پہنچاتی، اپنے قول وفعل سے کسی کے لیے مضرت ونقصان کا سامان نہیں کرتی، آپ نے ارشاد فرمایا: وہ تو جنتی عورت ہے، یعنی نیکیاں اور عبادات اگرچہ اس کے نامۂ اعمال میں کم ہیں؛ لیکن اپنی ذات کو ایسی پاکیزہ بنالینا جو دوسرے کے لیے تکلیف وپریشانی کا باعث نہ بنے، ایسی نیکی ہے جو بھاری بھاری اعمال کے اوپر نیکیوں کے اعتبار سے غالب آجانے والی اور بڑھ جانے والی ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد اِس طرح کی احادیثِ مبارکہ سے یہ ہے کہ دنیا میں بسنے والے انسان

دوسروں کے لیے اپنے آپ کو نافع ومفید بنانے کی فکر کریں، ہر شخص ان سے بے خوف ومطمئن رہتا ہو، کسی کو ان کے سلسلہ میں یہ اندیشہ، ڈر اور خطرہ نہ ہو کہ یہ ہمیں تکلیف پہنچا سکتا ہے، یہ ہمیں نقصان دے سکتا ہے اور یہ ہمارے لیے اذیت کا سامان بن سکتا ہے۔

کیا غیبت کی اجازت ہے؟

اِس حدیث کے مضمون سے بظاہر یہ محسوس ہوتا ہے کہ غیبت کی اجازت ہے، اس سلسلہ میں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ مطلقاً کسی کی غیبت کرنا ممنوع اور حرام ہے؛ البتہ چھ اسباب کی بنا پر کسی کے عیب کو دوسرے کے سامنے بیان کرنا شرعاً صحیح ہوگا:

(۱) ظلم سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے: یعنی ایک شخص دوسرے پر زیادتی کرتا ہے، اُس کے ساتھ ناانصافی کا معاملہ کررہا ہے، تو مظلوم کو شریعت اِس بات کی اجازت دیتی ہے کہ وہ قاضی، امیر یا کسی بھی ایسے شخص کے سامنے ظالم کے عیوب اور اس کی زیادتیوں کا ذکر کرے جو اسے انصاف دلانے پر قادر ہو۔

(۲) منکَر کو دُور کرنے کے لیے کسی سے مدد طلب کرتے ہوئے اور گناہ گار کو راہِ راست پر لانے کی کوشش میں کسی ایسے شخص سے اُس کے عیوب کا تذکرہ کرنا گناہ نہیں ہے جو اس معاملہ میں مؤثر کردار ادا کرسکے۔

(۳) مسئلہ معلوم کرنے کے لیے: یعنی کوئی شخص مفتی صاحب سے پوچھے کہ فلاں صاحب نے میرے ساتھ یہ بُرا معاملہ کیا ہے، اُن کا یہ طریقہ شرعاً درست ہے یا نہیں؟ یا مجھے ان کے رویے اور برتاؤ کا کیسے سامنے کرنا ہوگا، میں ان حالات سے کیسے نکل پاؤں گا وغیرہ وغیرہ۔

(۴) مسلمانوں کو کسی کے عمومی شر سے بچانے کے لیے اُن کے ساتھ خیر خواہی کرتے ہوئے شریر کے عیوب کا ذکر کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، اس کی متعدد شکلیں اور صورتیں ہوسکتی ہیں:

جیسے کسی معاملہ میں گواہی دینے والے لوگوں کا معیارِ شہادت سے گرا ہوا ہونا ایسی چیز ہے جس کی اطلاع ذمہ داران کو دی جائے گی کہ یہ شخص فلاں فلاں چیزوں کی وجہ سے گواہ بننے کا اہل نہیں ہے؛ کیوں کہ اس کی گواہی کی بنا پر اگر قاضی نے فیصلہ کردیا تو عامۃ المسلمین کو بھی اس سے نقصان ہوسکتا ہے۔

اسی طرح سسرالی رشتہ داری قائم کرنے کے سلسلہ میں یا کسی اور معاملہ میں کوئی مخلصانہ مشورہ طلب کیا جائے تو صحیح صحیح بات بیان کی جائے اور کوئی چیز چھپائی نہ جائے۔

(۵) جو شخص کھلم کھلا گناہ اور خلافِ شرع اعمال کا مرتکب ہو: جیسے شراب نوشی، ظالمانہ ٹیکس کی وصولیابی اور

لوگوں کے حقوق کو غصب کرنا وغیرہ، تو ایسے شخص کے عیوب کو سب کے سامنے بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

(۶) کسی انسان کی شناخت اور پہچان کے لیے بھی تنقیص کا قصد کیے بغیر اُس کے عیب کا ذکر کرنے کی اجازت ہے، جیسے کوئی صاحب: اعمش، اعرج، اعمیٰ اور اصم وغیرہ کے لقب سے معروف ہوں، تو اگرچہ اِن القاب میں عیوب کا تذکرہ ہے؛ لیکن شناخت کے لیے تذلیل کا ارادہ کیے بغیر ان کے استعمال کی اجازت ہے۔

(رياض الصالحين، باب ما يباح من الغيبة، الدرالمضود: ٤٤٢/١)

تکلیف مت پہنچاؤ

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ارشاد فرماتی ہیں: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہ تھا کہ جب گھر میں تشریف لاتے اور آرام فرمانے کا ارادہ ہوتا تو دروازوں کو بند فرما دیا کرتے تھے؛ اس لیے کہ آدمی سوجاتا ہے تو معلوم نہیں رہتا کہ کون آرہا ہے، کون جا رہا ہے، ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو آنے میں کچھ تاخیر ہوگئی، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا آپ کے لیے کھانا اور روٹی تیار کر چکی تھیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دیر میں آئے، تھکے ہوئے تھے، کھانا کھانے کے بجائے آرام فرمانے لگے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے میری ران کو تکیہ بنالیا اور اسی پر سر رکھ کر آپ آرام فرمانے لگے، کھانا تیار تھا، روٹی بنی ہوئی رکھی تھی، اتفاق یہ کہ آتے ہوئے آپ دروازہ بند کرنا بھول گئے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھ لگی ہی تھی کہ پڑوس کی بکری نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں داخل ہوئی اور اس ایک روٹی کو جس کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے آپ کے لیے تیار کیا تھا، اُٹھا کر لے جانے لگی، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے بکری کو آتے دیکھا، پھر روٹی کو لے جاتے دیکھا تو میں تو بڑی پریشان ہوگئی کہ میری تو ساری محنت پر اس بکری نے پانی پھیر دیا؛ لیکن جاؤں تو کیسے جاؤں، آپ کا سر مبارک ران پر ہے، آپ کو چھوڑ کر جاتی ہوں تو آپ بیدار ہو جائیں گے، ایک طرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آرام کا خیال اور دوسری طرف بکری کے اس روٹی کو لے جانے کا دل میں قلق، پہلو بدلا، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھ کھل گئی، مجھے دیکھا کچھ پریشان سی ہوں، پوچھا کیا بات، پریشان کیوں ہو؟ فرمایا کہ یارسول اللہ! بات یہ ہے کہ اتنے جتن کر کے آج روٹی بنائی تھی، یہ بکری آئی اور روٹی لے کر جا رہی ہے، اسے پکڑنا چاہتی ہوں، تیزی کے ساتھ بکری کے پیچھے دوڑیں، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ

وسلم نے ان کو نصیحت فرمائی: "**خذي ما أدركت من قرصک ولا تؤذي جارک في شاته**" فرمایا کہ: عائشہ! جو ہونا تھا ہوگیا، جتنی روٹی بچی ہوئی مل جائے اسے لے لو اور اپنے پڑوسی کو اس کی بکری کی وجہ سے بُرا بھلا مت کہنا، تکلیف مت پہنچانا۔(اخرجه البخاري في الأدب المفرد: ١٤٤/١)

ذرا سوچیے! نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کس درجہ شفیق تھے، پڑوسیوں اور عام انسانوں کے ساتھ رحم دلی وحسنِ اخلاق کا کیا معاملہ فرماتے تھے، کیا ہم لوگ بھی اِس طرح کے مواقع پر یہ دل دکھا سکتے ہیں؟

اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف پہنچائی

ایک موقعہ پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"**عن أنس رضي اللّٰه عنه قال، قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: آذىٰ جاره فقد آذاني، ومن آذاني فقد آذى الله، ومن حارب جاره فقد حاربني، ومن حاربني فقد حارب الله عزوجل**". (أخرجه أبوالشيخ بن حيان في كتاب التوبيخ بحواله الدرالمضدر: ٤٤٦/١)

یادرکھو! جو اپنے پڑوسی کو ستانے والا ہے درحقیقت مجھے ستانے والا ہے، اور جو مجھے ستانے والا ہے وہ درحقیقت اللہ کو تکلیف پہنچانے والا ہے، پھر فرمایا: جو اپنے پڑوسی سے جھگڑا کر رہا ہے وہ درحقیقت مجھ سے جھگڑ رہا ہے، اور جو مجھ سے جھگڑ رہا ہے وہ اللہ سے جھگڑا کرنے والا ہے۔

سوچیے! کہ کہاں سے کہاں بات پہنچ گئی، بظاہر دو پڑوسیوں میں جھگڑا ہو رہا ہے، جو زیادتی کرنے والا ہے وہ درحقیقت اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے جھگڑنے والا ہے، اور جو اللہ کے رسول سے جھگڑا کر رہا ہے وہ اللہ سے جھگڑ رہا ہے؛ کیوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے محبوب ہیں اور جو کسی کے محبوب سے جھگڑے گا اُس کے چاہنے والوں سے بھی وہ جھگڑا کرنے والا ہوگا۔

ہمارے ساتھ نہیں جانا

ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک تقاضہ پر تشریف لے جا رہے تھے، حضراتِ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم بھی ہمراہ تھے، آپ نے ساتھیوں کو جمع کر کے یہ اعلان فرمایا: "**لا يصحبنا اليوم من آذى جاره**" دیکھو بھائی! سب توجہ کے ساتھ سنو، جس نے اپنے پڑوسی کو ستایا ہوا اُسے ہمارے ساتھ ایک قدم بھی چلنے کا حق نہیں، وہ ہماری جماعت میں شامل نہیں ہوگا؛ اس لیے اگر کسی کی ذات سے پڑوسی کو تکلیف پہنچی ہو یا اُس نے پڑوسی پر

زیادتی وظلم کی ہو، وہ ابھی کنارہ کشی اختیار کرلے، ہمارے ساتھ چلنے کی ضرورت نہیں، وہاں جھوٹ بولنے کا تو سوال تھا ہی نہیں، موجود لوگوں میں سے ایک صاحب نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! ویسے تو میں نے پڑوسی کو کوئی تکلیف نہیں پہنچائی؛ البتہ ایک بات ضرور ہے کہ ایک مرتبہ بہت زور کا پیشاب لگ رہا تھا، تو میں نے پڑوسی کی دیوار کے جڑ میں پیشاب کردیا تھا ''**أنا بُلْتُ في أصل حائطه جاري**'' آپ نے فرمایا کہ جاؤ، تم ہمارے ساتھ نہیں جاؤ گے۔ (رواہ الطبراني بحوالہ الدرالمنضود: ۱/۶۴۴)

صرف اتنی سی بات پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اپنے ساتھ جانے کی اجازت نہیں دی؛ اس لیے کہ پڑوسی کی دیوار کی جڑ میں پیشاب کرنا ایسا عمل ہے کہ اگر اُس کو معلوم ہوگا تو اس کے دل کو تکلیف پہنچے گی، ہاں اگر پہلے سے اجازت لے لی جاتی، مجبوری کو ذکر دیا جاتا، کوئی اور جگہ نہ ہوتی، تو بات الگ تھی؛ لیکن یہاں نہ اجازت تھی، نہ رضامندی کا کوئی تصور تھا، اور لازمی طور پر یہ عمل دوسرے کے لیے تکلیف کا باعث ہوگا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی پر نوٹس لیا اور فرمایا کہ تم ہمارے ساتھ شامل نہیں ہوسکتے، یہ بظاہر معمولی معمولی چیزیں ہیں، اِن پر عمل کرنے کی ضرورت ہے، ہم اپنی زندگی کے اندر اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ان ہدایات کا نمونہ داخل فرمائیں گے تو اللہ لوگوں کے دلوں میں ہماری محبتیں پیدا فرمائیں گے اور انسانی سماج ومعاشرہ میں میل ملاپ، پیار ومودت کا ایسا ماحول قائم ہوگا کہ جس کو دیکھ کر بھی رشک کیا جائے گا۔

صبر کرو

فقیہ ابواللیث سمرقندی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک صحابی حاضر ہوئے اور اپنے پڑوسی کی شکایت کی، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو نصیحت فرمائی: پڑوسی تم پر جو زیادتی کررہا ہے وہ اپنی جگہ؛ لیکن تمہاری ذمہ داری یہ ہے کہ ''**كف أذاك عنه واصبر علىٰ أذاه وكفىٰ بالموت فراقا**''. (الدرالمنضود: ۱/۶۴۴)

وہ جو کررہا ہے اس کو کرنے دو، تم اپنی ذات سے اس کو تکلیف نہ پہنچنے دو، تم اس کی تکلیف پر صبر کرتے رہو، اس کے لیے ہدایت کی دعا مانگتے رہو، نہ ہمیشہ پڑوسی دنیا میں رہنے کے لیے آیا نہ ہمیشہ تم دنیا میں رہنے کے لیے آئے، کب کس کا بلاوا اللہ کی طرف سے آجائے، کچھ معلوم نہیں، پڑوس ختم ہوجائے گا، موت کی تیاری کرو، اس لڑائی جھگڑے میں مت پڑو، یہ وہ ہدایت ہے جس پر عمل کرنے کے لیے ظرف کا کشادہ ہونا اور دل کا بڑا ہونا ضروری ہے؛ ورنہ آدمی آج کے دَور میں اتنا کم ظرف ہوگیا ہے کہ جب تک وہ دوسرے کو چھٹی کا دودھ یاد نہیں

دلا دیتا اُس وقت تک اس کو چین نہیں ملتا، اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کا مزاج لوگوں کا بَن گیا ہے، کسی کی طرف سے ذرا سی کوئی تکلیف پہنچے گی تو تاک میں رہیں گے کہ اس کو ایسا جواب دیں کہ یہ بھی یاد رکھے، اس کے گھر والے بھی یاد رکھیں، موقع کی تلاش میں رہا جاتا ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا کہ صبر کرلو، اللہ سے اس ظالم کے لیے ہدایت کی دعا مانگ لو، دل تو اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے، باری تعالیٰ اُس کے دل کو بدلیں گے، ایک دن وہ آئے گا کہ جو اپنے دل میں تمہارے لیے عداوت ودشمنی رکھتا ہے، تمہارے حسنِ خلق کے نتیجہ میں تم سے سب سے زیادہ محبت کرنے والا بن جائے گا۔

حسنِ سلوک کا مطلب

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ ارشاد فرمایا کرتے تھے:

"لیس حسن الجوار کف الأذیٰ عن الجار ولٰکن حسن الجوار الصبر علی الأذیٰ من الجار". (الدرالمنضد: ۱/۴۴۷)

پڑوسیوں کے ساتھ حسنِ سلوک کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اُن کو تکلیف نہ پہنچائی جائے؛ بلکہ اصل حسنِ سلوک یہ ہے کہ اُن کی طرف سے آنے والی تکلیفوں پر صبر کیا جائے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ حسنِ سلوک کا مطلب یہ ہے کہ دوسروں کے ساتھ اچھا برتاؤ اور اچھا معاملہ کیا جائے، یہ تو لازمی نتیجہ ہے، اصل حسنِ سلوک یہ ہے کہ اگر دوسرے ہم پر زیادتی کر بھی رہے ہیں تو اُن کو برداشت کیا جائے، ہم کڑوے گھونٹ پی جائیں، اللہ کی رضا کے لیے صبر کر جائیں، جھگڑے کا دروازہ بند ہو جائے گا، اور اللہ ایک دن اس پتھر دل انسان کو بھی نرم کر دیں گے، اور وہ اپنے ذہن ودماغ سے آپ کی طرف مائل ہو جائے گا۔

پڑوسی کو تین چیزوں سے مامون رکھنا چاہیے

فقیہ ابواللیث سمرقندی رحمۃ اللہ علیہ نے احادیث کی روشنی میں پڑوسیوں کے حقوق کے سلسلہ میں بہت جامع نصیحت ارشاد فرمائی ہے: مسلمانوں کو زیب دینے والی چیز یہ ہے کہ وہ پڑوس کی طرف سے آنے والی تکلیفوں پر صبر کرنے والا ہو، اور کسی پڑوسی کو تکلیف پہنچانے والا نہ ہو، اور وہ اس حال میں زندگی گذارے کہ پڑوسی اس سے بالکل مامون اور مطمئن رہے، یہ اصل چیز ہے کہ ہماری زندگی ایسی ہونی چاہیے کہ ہمارے پڑوس میں رہنے والے لوگ ہم سے بالکل مطمئن رہیں، ان کو کسی طرح کا کوئی خوف اور اندیشہ ہماری جانب سے نہ ہو، پھر حضرت نے فرمایا: **"وأمانه لجاره یکون بثلاثة أشیاء: بالید وباللسان وبالعورة. فأما أمانه بلسانه: فهو**

أن لايتكلم بكلام لودخل عليه جاره لسكت أولوبلغ إلٰى جاره لاستحى منه. وأما أمانه بيده: فهو أن جاره لوكان بالسوق وتذكر أن كيسه نسيه في منزل فإنه لايخاف عليه ويعقل أن منزله ومنزلي سواء. وأما أمانه بالعورة: فهو أنه لوكان في السفر فبلغه أن جاره دخل منزله فيسكن قلبه وفرح". (الدرالمنضد: ۱/٤٤٧)

بنیادی طور پر پڑوسیوں کو تین چیزوں سے مامون رہنا چاہیے: (۱) پڑوسی کی زبان سے (۲) پڑوسی کے ہاتھ سے (۳) پڑوسی کی عزت سے۔

زبان سے مامون رہنے کا مطلب یہ ہے کہ: ہم کسی کے ساتھ کبھی کوئی ایسی بات کرنے والے نہ ہوں کہ اُس بات کے درمیان ہمارا پڑوسی آجائے تو ہمیں وہ بات روکنی پڑے، جب ہم اس پڑوسی کے خلاف کوئی بات کررہے ہوں گے تبھی اُس کو آتا دیکھ کر ہمیں بات کو موقوف کرنا پڑے گا؛ ورنہ ہم بات جاری رکھیں گے، یا کبھی ہم کسی کے ساتھ کوئی ایسی بات نہ کریں کہ اگر وہ بات پڑوسی تک پہنچ جائے تو ہمیں شرم آنے لگے، تمہاری زبان سے تمہارا پڑوسی مامون اور مطمئن رہنا چاہیے۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا میں بسنے والے کسی بھی فرد سے تمہاری گفتگو پڑوسی کے حق میں بُرائی والی نہ ہو، پڑوسی تم سے بالکل مامون رہے گا، اور تمہیں بھی ڈر نہیں رہے گا کہ میری طرف سے پڑوسی تک کوئی غلط بات پہنچادی جائے گی، جب بات غلط کہی ہی نہیں جائے گی تو پہنچائی بھی نہیں جائے گی، یہ ہے زبان سے محفوظ رہنے کا مطلب۔

اور ہاتھ سے محفوظ رہنے کا مطلب یہ ہے کہ: پڑوسی اپنا تھیلا چھوڑ کر بازار چلا جائے، بازار جانے کے بعد اس کو یاد آیا کہ میرا تھیلا تو پڑوس میں رہ گیا، تو وہ بے چین نہ ہو؛ بلکہ وہ یہ سوچے کہ پڑوسی کا گھر میرا گھر ہے، اس میں پریشان ہونے کی کیا ضرورت، آدمی اپنا قیمتی سامان اپنے گھر چھوڑ کر جائے تو وہ پریشان نہیں ہوتا، اسے اطمینان رہتا ہے کہ گھر سے کون چُرائے گا، اسی طرح کا اطمینان ہمیں اس وقت بھی ہو جب ہم پڑوس میں کوئی چیز بھول کر چلے جائیں، پیسوں کا بیگ بھول کر چلے گئے، سامان کا تھیلا بھول کر چلے گئے، یہ کب ہوگا؟ جب ہم پڑوسی کے سلسلہ میں مامون ہوں گے کہ اس نے کبھی ہمارا بُرا چاہا ہی نہیں، جب پڑوسی دیکھے گا کہ اس کا تھیلا گھر کے اندر رکھا ہے تو اس کو احتیاط کے ساتھ رکھ دے گا، ضائع نہیں ہونے دے گا۔

اور عزت کے محفوظ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ: جب ہمارا پڑوسی ہمارے گھر کے اندر داخل ہو تو پڑوسی کا دل مطمئن ہوجائے کہ اب میری عزت سے کوئی کھلواڑ نہیں کرسکتا، جس طرح اپنے گھر میں جانے کے بعد اپنے آپ کو مامون تصور کرتا ہے اِسی طرح پڑوسی کے گھر میں جانے کے بعد بھی وہ اپنے کو مامون تصور کرنے لگے۔

اپنا سامان باہر پھینک دو

عن أبي هريرة رضي اللّٰه عنه قال: قال رجل يارسول اللّٰه! إن لي جارا، يؤذيني، فقال: "انطلق فاخرج متاعک إلى الطريق" فانطلق فأخرج متاعه، فاجتمع الناس عليه "فقالوا: ماشانک؟ قال: لي جار يؤذيني فذكرت للنبي صلّى اللّٰه عليه وسلم فقال: انطلق فاخرج متاعک إلى الطريق فجعلوا يقولون اللّٰهم العنه، اللّٰهم اخزه، فبلغه فأتاه فقال: ارجع إلٰى منزلک فواللّٰه لا أوذيک. (أخرجه الحاكم في المستدرك :٤/١٦٥)

ایک صاحب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یارسول اللہ! میرا ایک پڑوسی ہے، اُس نے میری ناک میں دَم کر رکھا ہے، بہت پریشان کر رکھا ہے، کیا علاج کروں؟ میں نے اُس کو سمجھا بھی لیا، جن لوگوں کا اُس پر اثر ہوسکتا ہے، اُن سے بھی کہلوا دیا، اپنی تکلیف ودشواریوں کا اُس کے سامنے ذکر بھی کر دیا؛ مگر وہ اپنی عادتوں سے باز آنے کو تیار نہیں؟ تو عجیب علاج نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو سکھایا، یہ نہیں کہا اب جا کر اُس سے لڑو، یا اُس کو بُرا بھلا کہو؛ بلکہ فرمایا کہ: اگر پڑوسی تم کو ستا رہا ہے، سمجھانے کے بعد بھی سیدھے راستے پر نہیں آ رہا تو جاؤ اور اپنے گھر کا سب سامان نکال کر سڑک پر ڈال دو، تو سوال کرنے والے جو صاحب تھے اُن کو حیرانی بھی ہوئی کہ یارسول اللہ! تکلیف بھی پہنچ رہی ہے اور گھر کا سامان بھی میرا نکالا جا رہا ہے، آپ کا حکم سر آنکھوں پر؛ لیکن آپ کے فرمان میں عجیب مصلحت ہے، جس کو میں سمجھ نہیں پا رہا ہوں، آپ نے فرمایا کہ اس کا علاج یہی ہے؛ چناں چہ یہ گئے اور انہوں نے رفتہ رفتہ اپنے گھر کا سامان نکال کر باہر رکھنا شروع کر دیا، جوں جوں گھر سے سامان باہر آتا رہا، ویسے ہی محلے کے لوگ اکٹھا ہوتے رہے، کہ تم اچانک سامان کو باہر کیوں نکالنے لگے، کہیں دوسری جگہ جانے کا ارادہ بن گیا، جب کافی لوگ اکٹھے ہوگئے اور پوچھنے لگے، تو انہوں نے جواب دیا کہ بھئی! مجھے تو یہ حکم جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ملا ہے، میں نے پڑوس کی جانب سے آنے والی تکلیف کا تذکرہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تھا تو آپ نے مجھے یہ نصیحت فرمائی تھی کہ جاؤ! سامان نکال کر باہر رکھ دو، جیسے ہی لوگوں نے سنا کہ پڑوسی کے ستانے کی وجہ سے یہ آدمی اپنا گھر خالی کر رہا ہے تو سب کے سب اُس پڑوسی کو کوسنے لگے، اِس پر اللہ کی پھٹکار ہو، اللہ اس کو رسوا کرے، ذلیل کرے، اس نے تو پڑوسی کی زندگی اَجیرن کر دی، اب جب اس نے سنا کہ سارے محلے والے مجھے بُرا بھلا کہہ رہے ہیں، گالم گلوچ کر رہے ہیں، تو وہ باہر نکل کر آیا اور اس نے بڑی لجاجت ومنت وخوشامد کرتے ہوئے پڑسی سے کہا کہ تم اپنا سامان گھر میں رکھ لو، اب میں تمہیں کبھی تکلیف نہیں دوں گا۔

یہ طریقہ بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا، آپ اس طریقہ پر غور کیجیے کہ سانپ بھی مر گیا اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹی، کام بھی بن گیا، نہ کسی کے ساتھ لڑائی کی نوبت آئی نہ جھگڑے کی؛ لیکن اس طرح کا علاج اُسی وقت ممکن ہوسکتا ہے جب کہ محلّہ کے لوگ اچھی سمجھ رکھنے والے ہوں، اگر سب کی سمجھ وہی ہو جو تکلیف پہنچانے والے پڑوسی کی تھی، تو اسے تو گھر چھوڑ کر ہی جانا پڑے گا، آج کے زمانے میں یہ علاج اگر کیا جائے تو معلوم نہیں کوئی ساتھ دے گا یا نہیں، وہ زمانہ تو خیر القرون کا زمانہ تھا، ہر آدمی پریشان حال کی مدد کرنے کا جذبہ رکھتا تھا، آگے بڑھنے کے لیے تیار رہتا تھا، آج تو لوگ اپنے میں اتنے مگن ہیں کہ کوئی آدمی سامان نکالے، گھر صاف کرے، انہیں کسی کی پرواہ نہیں ہوتی، وہ تو اپنے کام میں لگا ہوا ہے۔

بہرحال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ سب کی سب نصیحتیں اور ارشادات یہ بتا رہے ہیں کہ انسان کا عمل اپنے آس پاس رہنے والے لوگوں کے ساتھ، پڑوسی کے ساتھ ایسا بہترین ہونا چاہیے کہ کسی کو اُس کی ذات سے کسی طرح کا اندیشہ اور خوف نہ ہو۔

سبق آموز واقعہ

دارالعلوم دیوبند کے ایک بڑے استاذ تھے حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب دیوبندیؒ، جس مکان میں حضرت رہا کرتے تھے اُس کی چھت کمزور تھی اور بارش کے زمانے میں عام طور پر وہ ٹپکا کرتی تھی، اُس گلی میں دوسرے جو گھر تھے اُن کی بھی صورتِ حال کچھ اِسی طرح کی تھی، سب خستہ حال تھے، سب کی چھتیں ٹپکا کرتی تھیں، ہر سال برسات کے زمانے میں حضرت کو اِس دشواری کا سامنا کرنا پڑتا تھا، شاگرد اصرار کرتے تھے کہ حضرت چھت کی مرمت کرالیجیے، درست کرالیجیے، پریشانی سے بچ جائیں گے؛ لیکن حضرت سُنی اَن سُنی کر دیا کرتے تھے، ایک مرتبہ ایک صاحب نے ارادہ کرلیا کہ حضرت کی چھت کو درست کرانا ہے؛ چناں چہ حضرت کو آمادہ کرنے کی کوشش کی گئی؛ لیکن حضرت تیار نہ ہوئے، جب لوگوں نے بہت اصرار کیا اور پوچھا کہ حضرت آپ چھت درست کیوں نہیں کرالیتے، شرعی اعتبار سے اِس میں کون سا حرج ہے، یہ تو انسان کی ضرورت ہے، اور انسان شرعاً ضرورت پوری کرسکتا ہے، اس میں کوئی رکاوٹ نہیں، فرمایا: کہ میں اگر چھت درست کروانا چاہوں تو خود کرواسکتا ہوں؛ لیکن میں یہ سوچتا ہوں کہ اس گلی میں مجھ جیسے مکانات اور لوگوں کے بھی ہیں، اگر میں صرف اپنی چھت درست کرا کر برسات کے زمانے میں آرام سے رہوں اور میرے پڑوس میں رہنے والے لوگوں کی چھتیں ٹپکتی رہیں تو مجھے آرام کی نیند نہیں آئے گی، میرے پاس جب تک اتنا سرمایہ نہیں ہوگا کہ اپنے پڑوسیوں کی

چھت کو درست کرلوں تب تک اپنی چھت کو بھی درست نہیں کرا سکتا، جس حال میں وہ خوش ہیں اُسی حال میں میں خوش ہوں، اب یہ جذبہ انسان کے دل میں کہاں اور کب پیدا ہوسکتا ہے کہ وہ دوسرے کے دل کو تکلیف نہ پہنچانے کی خاطر مشقت برداشت کررہا ہے، کہ کہیں ہمارے اس عمل سے پڑوسی کے دل کو تکلیف نہ پہنچ جائے کہ مولانا صاحب اپنی چھت تو ٹھیک کرا رہے ہیں اور ہم بارش میں پریشان ہورہے ہیں، ٹپکی ہوئی چھت کے نیچے زندگی گزار رہے ہیں۔

یہ اثر ہے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشاداتِ مبارکہ کا جن میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑوسیوں کے حقوق کو بیان فرمایا ہے؛ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ جتنی تاکید نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان حقوق کی ادائیگی کے سلسلہ میں فرمائی ہے، اُتنی ہی کوتاہی اور غفلت اس حوالہ سے ہمارے سماج میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ معمولی معمولی باتوں پر پڑوسیوں کے درمیان جھگڑے ہوتے ہیں اور اتنے بڑھ جاتے ہیں کہ بات چیت بند ہوجاتی ہے، آنا جانا بند ہوجاتا ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے دو پڑوسیوں کے لیے جو آپس میں جھگڑنے والے ہوں، اللہ کی رحمت سے محروم ہونے کی بات احادیثِ مبارکہ میں ذکر فرمائی ہے کہ ان کی دعائیں قبول نہیں ہوں گی، وہ اس وقت تک جنت میں داخل نہیں ہو پائیں گے جب تک کہ آپس میں محبت رکھنے والے نہ بن جائیں۔

اصلاحِ معاشرہ

قرآن میں ہوغوطہ زن اے مردِ مسلمان!

ازقلم: مولانا محمد عمرین محفوظ رحمانی صاحب، سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت میں ایک نمایاں نام حضرت عبداللہ ابنِ مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہے، وہ صحابیٔ رسول تو تھے ہی، ساتھ ہی انہیں خادمِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہونے کا شرف بھی حاصل تھا، انہیں کاشانۂ نبوت میں آنے جانے کی خصوصی اجازت حاصل تھی، مسلم شریف کی روایت میں اس کا تذکرہ ہے، حضرت عبداللہ ابنِ مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے صحبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے خوب فائدہ اُٹھایا اور اپنے دامنِ مراد کو علم کے بیش قیمت موتیوں سے بھرلیا، ان سے اٹھارہ سو اڑتالیس (۱۸۴۸) روایتیں مروی ہیں، وہ تفسیرِ قرآن، قرأتِ قرآن اور فقہ وفتویٰ میں ممتاز حیثیت کے مالک تھے، ان کی اہم ترین خصوصیت قرآنِ پاک سے گہرا شغف ہے، وہ حافظِ قرآن تھے، انہوں نے خود زبانِ رسالت سے سُن کر قرآنِ پاک حفظ کیا تھا، انہیں قرآنی علوم پر بڑی دسترس تھی، بخاری شریف میں ہے وہ خود اپنے بارے میں فرماتے ہیں: اللہ پاک کی قسم جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، قرآنِ پاک کی ہر آیت کے بارے میں مجھے علم ہے کہ وہ کہاں نازل ہوئی، اور مجھے یہ بھی علم ہے کہ وہ کس کے بارے میں نازل ہوئی، اگر مجھے یہ پتہ چل جائے کہ کوئی کتاب اللہ کے بارے میں مجھ سے زیادہ جانتا ہے اور اس کے مقام تک سواری پہنچ سکتی ہو تو میں اپنے اونٹ پر سوار ہوکر ضرور اس تک پہنچوں گا۔ (بخاری شریف، کتاب فضائل القرآن، حدیث نمبر: ۵۰۰۲)

اِس روایت سے جہاں ان کے علومِ قرآنی پر دسترس کا علم ہوتا ہے وہیں ان کے شوقِ علم کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

سیّدنا حضرت عبداللہ ابنِ مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ دن کے اوقات میں قرآنِ کریم کی تعلیم دیا کرتے تھے اور رات کو جب لوگ سو جاتے تو یہ نوافل میں کلامِ پاک کی تلاوت کرتے، ان کی مجلس کا بھی عجیب انداز تھا، لوگ جب ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تو قرآنِ پاک کھول کر بیٹھ جاتے، تلاوت کا سلسلہ شروع ہوجاتا اور حضرت ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ حاضرین کے سامنے پڑھی جانے والی آیتوں کی تفسیر بیان فرماتے۔

چوں کہ حضرت ابنِ مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اوڑھنا بچھونا قرآن ہی تھا اور دن رات وہ کلامِ پاک ہی سے جُڑے

رہتے تھے؛ اِس لیے جب ان سے نصیحت کی درخواست کی جاتی تو وہ کلامِ پاک کے سلسلے ہی میں نصیحت فرماتے تھے، مجمع الزوائد میں ہے کہ: حضرت ابنِ مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ اکثر وبیشتر یہ نصیحت فرمایا کرتے تھے "**أديمو النظر في المصحف**" (ہمیشہ قرآنِ پاک پر نگاہ رکھا کرو) ایک مرتبہ ایک شخص حاضر خدمت ہوا، اُس نے نصیحت کی درخواست کی، حضرت ابنِ مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کی بندگی کیا کر، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرا اور جہاں بھی جا قرآنِ پاک کے ساتھ جا، یعنی ہمیشہ تلاوت کا اہتمام کر''۔ (فضائل القرآن: ۴۷)

اِسی طرح ایک اور شخص نے ان سے نصیحت کی درخواست کی، تو آپ نے ارشاد فرمایا: جب تم اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان سنو! ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ تو پوری طرح متوجہ ہو جاؤ؛ اِس لیے کہ ان الفاظ کے بعد اللہ تعالیٰ کسی بھلائی کا حکم دیتے ہیں یا کسی بُرائی سے روکتے ہیں۔ (فضائل القرآن: ص/۷۵)

حضرت ابنِ مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے شغف قرآن اور ان کی نصیحتوں میں ہمارے لیے بڑا سبق ہے اور قرآنِ پاک سے وابستگی میں ہماری دنیا وآخرت دونوں کی بھلائی پوشیدہ ہے۔

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں!
اللہ کرے تجھ کو عطا جدتِ کردا

اصلاحِ معاشرہ (قسط چہارم)

قلب کو اخلاقِ محمودہ سے مزین کرنے کا بیان

ازقلم: مفتی محمد سلطان خان قاسمی، امام وخطیب مسجد ابوبکر صدیق، ڈی جے ہلی، بنگلور

اِس کی دوسری اصل:

اللہ تعالیٰ کا خوف

پہلی اصل کا بیان پچھلی تین قسطوں میں ہوا، جن میں توبہ کرنے کی ترغیب اور اس کی فضیلت، اِسی طرح توبہ نہ کرنے کے اسباب اور ان کا علاج اور آخری قسط میں گناہِ صغیرہ سے توبہ کرنے کی ترغیب اور گناہِ صغیرہ کو ہلکا سمجھ کر اس پر اصرار کرنے کے اسباب اور ان کا علاج بیان کیا گیا، اب مندرجہ ذیل دوسری اصل کا بیان ہے۔

چوں کہ اپنے گناہوں پر نادم اور اپنے قصوروں وجرم عدولیوں پر پشیمان وہی شخص ہوسکتا ہے جس کا دل اللہ کے خوف سے لبریز ہو؛ کیوں کہ حق تعالیٰ شانہٗ کا خوف نیک کاموں میں رغبت کرنے اور تمام گناہوں سے بچنے کا ذریعہ اور سبب ہے؛ اِسی لیے اللہ تعالیٰ نے اللہ سے خوف کرنے والوں کی شان میں ارشاد فرماتے ہیں: ﴿وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ○ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاوٰى ○﴾ (سورۂ نازعات، آیت: ۴۰-۴۱) ترجمہ: لیکن وہ شخص جو اپنے پروردگار کے سامنے کھڑا ہونے سے خوف رکھتا تھا اور اپنے نفس کو بُری خواہشات سے روکتا تھا تو جنت ہی اُس کا ٹھکانا ہوگی۔

دوسری جگہ ارشادِ باری عزاسمہٗ ہے: ﴿يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ ○ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَيَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ﴾ (سورۂ نور، آیت: ۳۷-۳۸) ترجمہ: وہ اس دن سے ڈرتے رہتے ہیں جس میں دل اور نگاہیں اُلٹ پلٹ کر رہ جائیں گی، نتیجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو ان کے اعمال کا بہترین بدلہ دے گا اور اپنے فضل سے مزید کچھ اور بھی دے گا۔

مذکورہ دونوں آیتوں سے معلوم ہوا کہ آخرت کی تمام تر نعمتیں اور سعادتیں وہ ان لوگوں کے لیے ہیں جو دنیا میں رہ کر اللہ تعالیٰ سے خوف کھاتے تھے اور موت کے بعد اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے سامنے حاضر ہونے سے ڈرتے تھے۔

بریں بنا حجۃ الاسلام حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی اِس تحریر میں خوف کی حقیقت اور اس کو حاصل

کرنے کا طریقہ اور آدمی کو اپنی زندگی کے کن حالتوں میں اللہ کا خوف غالب ہونا چاہیے اور کن حالتوں میں اللہ سے اُمید غالب ہونی چاہیے اِس کو بیان کیا ہے۔

خوف کی حقیقت

''خوف کے حقیقی معنیٰ یہ ہیں کہ: کسی آنے والی تکلیف کے اندیشہ سے دل دکھے اور سوزش پیدا ہو''۔

اللہ کے خوف کو حاصل کرنے کا طریقہ

''جب تک حق تعالیٰ شانہٗ کی صفاتِ جلالیہ کی معرفت حاصل نہ ہوگی اُس وقت تک خوف پیدا نہ ہوگا؛ اِس لیے جب ہمارے ذہنوں میں یہ بات اچھی طرح بیٹھ جائے گی کہ خداوند تعالیٰ ہر چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی چیز پر قادر ہے، کہ دَم بھر میں جو چاہے کرے کہ مخلوق میں کوئی شخص چوں بھی نہیں کرسکتا، تو اُس وقت خوف وخشیت پیدا ہوجائے گی؛ نیز اگر خوف پیدا کرنا ہو تو حق تعالیٰ شانہٗ کے جلال اور اُس کی بے نیازی پر نظر کرو اور سوچو: جنت تیار ہوچکی ہے، اور اس میں جانے والی مخلوق بھی تجویز ومتعین ہوچکی ہے اور اسی طرح دوزخ بھی موجود ہے اور اس کی سزاوار مخلوق بھی معین ہوچکی ہے اور سعادت وشقاوت یعنی خوش قسمتی وبدنصیبی کا قطعی حکم ہر شخص کی تقدیر میں لکھا جاچکا ہے، جس میں تغیر وتبدل نہیں ہوسکتا اور اس ازلی حکم کا کوئی روکنے والا نہیں، پس اے نفس! معلوم ہوا کہ تیرے حق میں کیا حکم صادر ہوا ہے اور تیرا خاتمہ کس حال میں ہونا لکھا ہے، ممکن ہے تو جنت میں جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ تیرے لیے جہنم کی دائمی سزا تجویز ہوئی ہو، خوب یاد رکھو! کہ انجام کے مخفی وپوشیدہ حال سے نڈر وہی شخص ہوسکتا ہے جس کو حقیقی معرفت حاصل نہ ہو۔

لہٰذا مناسب ہے کہ ان کاملین اور خاصانِ خدا کے حالات پڑھا اور سنا کرو، جن کو معرفت میں کمال حاصل ہے، یعنی انبیاءِ کرام علیہم السلام اور اولیاءِ عظیم وعلماءِ کرام واہلِ بصیرت رحمہم اللہ تعالیٰ، دیکھو! ان حضرات کو باوجود کمال درجہ تقرب کے کس قدر خوف تھا۔

حضرت جبرئیل علیہ السلام کا خوف

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: جب کبھی جبرئیل امین علیہ السلام میرے پاس وحی لے کر آئے تو خداوند جبار وقہار کے خوف سے لرزتے اور کانپتے ہوئے آئے۔

حضراتِ انبیاء علیہم السلام کا خوف

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قلب نماز کی حالت میں خوف کے سبب ایسا جوش مارتا تھا جیسے چولھے پر ہانڈی کھولتی ہے اور جوش وخروش کی آواز ایک میل کی مسافت سے سنائی دیا کرتی تھی۔ حضرت داؤد علیہ السلام چالیس دن کامل سربسجود گریہ کرتے رہے، یہاں تک کہ آنسوؤں کے سبب آس پاس کی زمین پر گھاس پیدا ہوگئی۔

(تبلیغ دین: ص ر ١٧١، ترجمہ از: منہاج العابدین)

سیّد المرسلین وخاتم الانبیاء علیہ السلام کا خوف

اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا تعارف کروایا اور اپنے معمولات اور احوال سے واقف کروایا اور امت کو ایک سبق دیا کہ ہر امتی کس طرح اللہ کے خوف کے معاملے میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کر سکے؛ چناں چہ حدیث کے الفاظ ہیں: ”**أما والله! إني لأخشاكم لله وأتقاكم له**“.

(بخاری: ج ر ٢، حدیث: ٥٠٦٣ کتاب النکاح باب ترغیب فی النکاح)

دوسری روایت میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ سے ڈرنے اور احوالِ قیامت کے استحضار کی تاثیر کو بیان کیا ہے، حدیث شریف پیش خدمت ہے: ”**عن أنس رضي الله عنه قال، قال رسول الله صلّى الله عليه وسلم: لوتعلمون ماأعلّم لضحكم قليلًا ولبكيتم كثيراً**“.

(بخاری: ج ر ٢، حدیث: ٦٢٣٧ کتاب الرقاق)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اگر تم (احوالِ قیامت کو اِس طرح جان لو جس طرح میں جانتا ہوں تو ضرور بالضرور تم ہنسنا کم کردو گے اور رونا زیادہ کردو گے۔

مذکورہ بالا دونوں روایتوں میں یہ بات اچھی طرح واضح ہوجاتی ہے کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے سیّد الانبیاء وفخر الرسل ہونے کے باوجود کس قدر اللہ سے ڈرنے کا حق ادا کیا اور ہم امتیوں کو ایک عملی پیغام عنایت فرمایا۔

مزید برآں حضرت امام غزالی رحمہ اللہ تعالیٰ نے حضراتِ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے احوال کو بھی ذکر فرمایا ہے کہ حضراتِ صحابہؓ کس طرح اللہ سے خوف کرتے تھے اور اللہ کے سامنے قیامت کے دن پیشی پر کتنا ڈرتے تھے۔

حضراتِ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کا خوف

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ایک پرندہ کو مخاطب بنا کر یوں فرمایا کہ: اے کاش! مَیں بھی تجھ جیسا پرندہ ہی ہوتا، کہ شریعت واحکامِ خداوندی کا مکلّف نہ ہوتا، یا کاش! پیدا ہی نہ ہوا ہوتا۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: کاش! میں درخت ہوتا کہ کاٹ لیا جاتا۔ اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ: کاش! میں بھولی بسری ہوجاتی۔

غرض خوب یادرکھو! کہ جن حضرات کو حق تعالیٰ کی بے نیازی اور جلال کی معرفت حاصل ہے وہ ہرگز بھی بے خوف اور نڈر نہیں رہ سکتے، نڈر ہونا انھیں غفلت شعار المرء کا شیوہ ہے جنکی نہ اپنے خاتمہ پر نظر ہے اور نہ اصلاحِ آخرت کی طرف توجہ، یہ غفلت کے پتلے اس بے خوف بچہ کی مثل ہیں جس کو زہریلے سانپ سے بھی ڈر نہیں لگتا؛ مگر بچہ دوسرے کے سمجھانے سے سمجھ تو جاتا ہے، پس اے کاش! جس طرح ناسمجھ بچہ اپنے سمجھ دار باپ کو سانپ سے ڈراتا ہوا اور بچتا ہوا دیکھ کر خود بھی بھاگتا اور عقل سیکھتا ہے، اسی طرح غافل اور بے خبر مسلمان بھی اپنے محسن ومربی طبیبوں اور خاصانِ خدا کی حالتِ خوف کو دیکھ کر حق تعالیٰ کی جانب دوڑتا ہے۔ (تبلیغ دین، ترجمہ از: منہاج العابدین: ص/۱۷۱)

اللہ تعالیٰ سے خوف کی زیادتی

کس وقت ممدوح اور کس وقت مذموم ومضر ہے؟

اللہ تعالیٰ سے خوف اُسی حد تک ممدوح اور پسندیدہ ہے جب تک کہ وہ نیکوکاری کا آلہ بنے، یعنی اتنا زیادہ نہ ہو کہ بیکار بنادے اور مایوسی کی حد تک پہونچا کر اعمال چھڑادے؛ کیوں کہ ایسا حد سے بڑھا ہوا خوف جس سے نا اُمیدی پیدا ہوجائے شرعاً مذموم وناپسندیدہ ہے، جیسا کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ''ایمان خوف اور اُمید کے درمیان ہے''، پس خوف کے ساتھ رجا یعنی اُمید بھی ضروری ہے۔ (تبلیغ دین، ترجمہ از: منہاج العابدین: ص/۱۷۱)

ایمان کس کیفیت کا نام ہے؟

ایمان امید اور خوف کے درمیان ہے، اللہ کی رحمت کی اُمید بھی ہو اور اس کے عذاب کا خوف بھی، جب یہ دونوں جمع ہوجائیں تو ایمان کامل ہوجاتا ہے۔ اگر اللہ رب العالمین کی رحمت کی اُمید نہ رہے؛ بلکہ آدمی اللہ کی رحمت سے مایوس ہوجائے تو بعض صورتوں میں یہ مایوسی کفر ہے اور ایسی صورت میں ایمان بھی باقی نہیں رہتا، اِسی

طرح اگر خوف غالب آجائے اور آدمی اللہ کی رحمت سے بالکل مایوس ہوجائے تو یہ بھی کفر ہے، اِسی طرح اگر اُمید اتنی بڑھ جائے کہ اللہ تعالیٰ کا خوف اور ڈر ہی باقی نہ رہے، اُس کے عذاب کی کوئی فکر ہی نہ رہے، تو یہ بھی کفر ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اُمید اتنی بڑھ جائے کہ خوف نہ رہے، تب بھی ایمان باقی نہیں رہتا اور خوف اتنا بڑھ جائے کہ اُمید بالکل باقی نہ رہے تب بھی ایمان باقی نہیں رہتا، ایمان اُس وقت باقی رہتا ہے جب اللہ کی رحمت کی اُمید بھی ہو، اُس کے عذاب کا خوف بھی ہو۔ (اصلاحی تقریری: ج/۹، ص/۱۲۷ از مفتی اعظم پاکستان مولانا رفیع عثمانیؒ)

''البتہ گناہ گار مسلمان کو خوف غالب رکھنا چاہیے اور جب دیندار بن جائے تو دونوں مساوی درجہ پر رکھے''۔

(تبلیغ دین، ترجمہ از: منہاج العابدین: ص/۱۷۲)

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا اُمید وخوف

حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: اگر آخرت میں اللہ کا حکم صادر ہو کہ ساری مخلوق میں سے صرف ایک شخص جنت میں جائے گا تو میں اُمید کرتا ہوں کہ وہ شخص میں ہی ہوں گا اور اگر فرمان جاری وصادر ہو کہ دوزخ میں صرف ایک ہی شخص داخل ہوگا تو مجھے خوف ہے کہ وہ شخص می ہی نہ ہوں، یہ حالت مساوات اور ایمانِ کامل کی علامت ہے، جس میں خوف ورجاء دونوں کے پلے برابر ہیں۔ (سیر الصحابہؓ بحوالہ کنز العمال: ۱/۱۵۷)

جوانی میں خوف اور بُڑھاپے میں رجاء کا غلبہ مفید ہے

یاد رکھنا چاہیے کہ جوانی وتندرستی کے زمانہ میں مسلمان کو خوف غالب رکھنا چاہیے کہ اس غلبۂ شہوت کے زمانہ میں شہواتِ نفسانیہ کے توڑنے اور منزلِ مقصود تک پہونچنے کے لیے مہذب بنانے کو خوف کے کوڑے کی ضرورت ہے اور بڑھاپے یا مرض الموت کے زمانہ میں جب کہ موت قریب ہو تو رجاء یعنی اُمید کو غالب رکھنا چاہیے کہ اوّل تو ضعف ونقاہت اور مرض کی وجہ سے کچھ ہوتا ہی نہیں، پھر اگر اس حالت میں خوف کا غلبہ رہا تو جو کچھ ہو رہا ہے اتنا بھی نہ ہو سکے گا اور بالکل ہی ہاتھ پاؤں پھول جائیں گے، حدیث شریف میں آیا ہے: ''مسلمان کو مرتے وقت اپنے خدا کے ساتھ نیک گمان رکھنا چاہیے''۔ (تبلیغ دین، ترجمہ از: منہاج العابدین)

رجاء اور ہوس کا فرق

حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اُمید اور خوف کو بیان کرنے کے بعد اُمید اور ہوس کے بارے میں وضاحت فرمائی ہے، گویا حضرت والا علیہ الرحمہ نے اکثروں کی غلط فہمی کا ازالہ کیا ہے۔

ظاہر ہے اللہ تعالیٰ سے نیک گمان اُسی وقت ہوگا جب کہ کچھ نیک اعمال بھی پاس ہوں؛ کیوں کہ انسان جب کاشت کے لیے زمین میں بیج ڈالتا ہے اور نیولانے یا پانی دینے کے متعلق اپنی جیسی سعی سب کچھ کر لیتا ہے تو اُسی وقت اللہ کے فضل پر بھروسہ کر کے پیداواری اور بوئے ہوئے کے کاٹنے کی اُمید رکھ سکتا ہے۔ اور جب تک بیج نہیں ڈالا اور ایسی حالت میں اناج کی وہ طلب اور خواہش رکھے تو اُس کو رجاء اور اُمید نہیں کہتے؛ بلکہ تمنا اور ہوس کہتے ہیں اور تمنا و ہوس شیطانی دھوکہ ہے؛ اِس لیے حق تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِکَ یَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ﴾ (سورۂ بقرہ، آیت:۲۱۸) ترجمہ: جو بندے ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور اللہ کے راستہ میں جہاد کیا تو وہی اللہ کی رحمت کے اُمیدوار ہیں۔

اِس سے معلوم ہو گیا کہ رجاء و اُمید؛ سعی و کوشش کے بعد ہوا کرتی ہے، جس طرح کاشت کار بونے جوتنے کی پوری محنت کر لینے کے بعد منتظر ہوتا ہے کہ اگر آسمانی آفت سے حفاظت ہوئی اور بجلی، اولہ، آگ وغیرہ سے کھیت کو حق تعالیٰ نے بچائے رکھا تو اُمید ہے کہ جتنا بیج ڈالا ہے ایک ایک کے بدلہ ستر ستر؛ بلکہ اس سے بھی زیادہ حاصل ہوں گے۔ اِسی طرح مسلمانوں کو خدا تعالیٰ کی اطاعت میں پوری مشقت اُٹھانے اور مجاہدہ دریافت کرنے کے بعد اُمید رکھنی چاہیے کہ اگر حق تعالیٰ شانہٗ نے اپنے فضل سے میرے اعمال و افعال کو قبول فرمالیا تو ایک ایک نیکی کا سات سات سو گنا؛ بلکہ اس سے بھی زیادہ اجر ملے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ خوفِ عذاب کے باعث معاصی اور خدا کی نافرمانیوں سے رُکنا چاہیے اور رحمتِ الٰہی کے سبب نیکیوں میں رغبت ہونی چاہیے، پس خوف کو اُسی وقت معتبر سمجھو جب کہ وہ تم کو معصیت سے روکے اور گناہ کی جرأت نہ ہونے دے اور اگر یہ حاصل نہ ہو تو وہ خوف نہیں؛ بلکہ عورتوں جیسی رقّتِ قلبی اور وہم و خیال ہے، جس کا کچھ اعتبار نہیں۔ (تبلیغ دین، ترجمہ از منہاج العابدین، مترجمہ: حضرت مولانا عاشق الٰہی میرٹھیؒ، ص/۱۷۳)

اللّٰهمّ إنّا نسئلک من خشیتک ماتحول به بیننا وبین معاصیک ومن طاعتک ماتبلغنا به جنتک ومن الیقین ماتهون علینا مصائب الدنیا، آمین.

اصلاحِ معاشرہ

مسلمان کے ساتھ خیر خواہی

ازقلم: مفتی عبداللطیف صاحب قاسمی، استاذ مدرسہ عربیہ غیث الہدیٰ بنگلور

ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر جو حقوق ہیں؛ اُن میں سے ایک اہم حق مسلمان کے ساتھ بھلائی اور خیر خواہی کا معاملہ ہے، مسلمانوں کے ساتھ خیر خواہی کرنے سے آپس میں محبت اور اُلفت پیدا ہوتی ہے، دل کینہ، حسد، بغض اور نفرتوں سے پاک ہوتے ہیں، خیر خواہ سے لوگوں کو محبت ہوتی ہے، بدخواہ سے لوگ دُور بھاگتے ہیں، خیر خواہی وہی کرسکتا ہے جو بے غرض ہو، ہر ایک کے لیے دل میں وسعت وفراخی رکھتا ہو اور اس کا دل کینہ، بغض، عداوت اور حسد سے پاک ہو۔

ایک مسلمان کے ساتھ وہ معاملہ کیا جائے جو اس کے حق میں بہتر ہو، اس کے حقوق ادا کیے جائیں، اس کی راحت رسانی کی فکر کی جائے، اس کو تکلیف واذیت پہنچانے سے گریز کیا جائے، دینی ودنیوی اُمور میں اپنے دینی بھائی کے لیے اس امر کی خواہش کرے، کوشش کرے اور اس کی رہبری کرے جس جس میں اُس کی بھلائی ہو، مصیبت میں مبتلا ہوجائے، تو مصیبت میں مبتلا ہوجانے پر نہ خوشی کا اظہار کرے نہ ہی خوش ہو؛ بلکہ اپنی طاقت کے موافق اس کو دُور کرنے کی کوشش کرے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف الفاظ میں ارشاد فرمایا ہے:

عَنْ أَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: لَايُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتّٰى يُحِبَّ لِأَخِيْهِ مَايُحِبُّ لِنَفْسِهِ. (رواه البخاري، كتاب الإيمان، باب من الإيمان أن يحب لأخيه مايحب لنفسه:١٣)

''تم میں سے کوئی شخص مومن (کامل) نہیں ہوسکتا؛ جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لیے وہ نہ چاہے جو اپنے لیے چاہتا ہے، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے ساتھ خیر خواہی کرنے کو ایمان کے کمال کا ذریعہ بتایا ہے''۔

عَنْ عَلِيٍّ قَالَ، قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لِلْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ سِتٌّ بِالْمَعْرُوْفِ: يُسَلِّمُ عَلَيْهِ إِذَا لَقِيَهُ وَيُجِيْبُهُ إِذَادَعَاهُ وَيُشَمِّتُهُ إِذَاعَطَسَ وَيَعُوْدُهُ إِذَامَرَضَ وَيَتْبَعُ جِنَازَتَهُ إِذَامَاتَ وَيُحِبُّ لَهُ مَايُحِبُّ لِنَفْسِهِ. (رواه الترمذي)

حضرت تمیم داری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

إِنَّ الدِّيْنَ النَّصِيْحَةُ، إِنَّ الدِّيْنَ النَّصِيْحَةُ، إِنَّ الدِّيْنَ النَّصِيْحَةُ، قَالُوْا: لِمَنْ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! قَالَ: لِلّٰهِ وَكِتَابِهٖ وَرَسُوْلِهٖ وَأَئِمَّةِ الْمُؤْمِنِيْنَ وَعَامَّتِهِمْ،أَوْأَئِمَّةِ الْمُسْلِمِيْنَ وَعَامَّتِهِمْ. (سنن أبي داؤد، كتاب الآداب، باب النصيحة: ٤٩٤٤)

''دین سراسر خیر خواہی ہے، دین سراسر خیر خواہی ہے، دین سراسر خیر خواہی ہے، یعنی دین کے وجود اور بقا کا دارومدار خیر خواہی پر ہے، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات بار بار دہرائی، تو صحابہؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ! خیر خواہی کس کے ساتھ کرنی ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ، اُس کی کتاب، اُس کے رسول، حکومت کے سربراہان اور عام مسلمانوں کے ساتھ خیر خواہی کا معاملہ کرنا ہے''۔

اللہ تعالیٰ کے ساتھ خیر خواہی:

اللہ تعالیٰ کے ساتھ خیر خواہی یہ ہے کہ اُس کی ذات اور اُس کی صفات پر جیسے وہ متصف ہے ایمان لانا، صرف اسی کی بندگی کرنا، اس کے ساتھ ذات وصفات میں کسی کو شریک نہ ٹھہرانا اور اس کے احکام پر عمل کرنا۔

اللہ کی کتاب کے ساتھ خیر خواہی:

اللہ کی کتاب پر ایمان لانا، اُس کی عظمت کرنا، اُس سے محبت کرنا، اُس کی تلاوت کرنا، اُس کی تبلیغ واشاعت کرنا، اس میں تدبر اور غور وفکر کرنا، اُس کے احکام پر عمل کرنا اور اُس کی طرف لوگوں کو دعوت دینا۔

اللہ کے رسول کے ساتھ خیر خواہی:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا، آپ سے محبت کرنا، آپ کی تعظیم کرنا، آپ کی شان میں نہ غلو کرنا، نہ آپ کی توہین کرنا، آپ کی سنت وشریعت پر عمل کرنا، آپ کے دین کی نشر واشاعت کرنا۔

اُمراء کے ساتھ خیر خواہی:

واجب اور جائز اُمور میں ان کی اطاعت اور پیروی کرنا، ان کے ساتھ معاونت کا معاملہ کرنا، شدید مجبوری کے بغیر ان سے بغاوت نہ کرنا۔

عام مسلمانوں کے ساتھ خیر خواہی:

عام مسلمانوں کی بھلائی کی بات سوچنا، اُن کے ساتھ حسنِ سلوک کا معاملہ کرنا، اُن کے ساتھ وہ معاملہ کرنا

جوان کے حق میں مناسب اور بہتر ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

حَقُّ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ سِتٌّ، قِيْلَ: مَاهُنَّ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ: إِذَا لَقِيْتَهُ، فَسَلِّمْ عَلَيْهِ، وَإِذَا دَعَاكَ، فَأَجِبْهُ، وَإِذَااسْتَنْصَحَكَ، فَانْصَحْ لَهُ، وَإِذَا عَطَسَ فَحَمِدَ اللّٰهَ، فَشَمِّتْهُ، وَإِذَا مَرِضَ، فَعُدْهُ، وَإِذَامَاتَ فَاتَّبِعْهُ. (رواه مسلم عن أبي هريرةؓ، كتاب الآداب، باب من حقّ المسلم على المسلم: ٢١٦٢)

''ایک مسلمان کے دوسرے پر چھ حقوق ہیں، عرض کیا گیا: وہ حقوق کیا ہیں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ سلم نے فرمایا: جب کوئی مسلمان تم سے ملاقات کرے، تو تم اُس کو سلام کرو، جب وہ دعوت دے تو اُس کی دعوت قبول کرو، جب وہ تم سے خیرخواہی چاہے تو اُس کے ساتھ خیرخواہی کرو (جب تم سے اپنے کسی معاملے میں مشورہ طلب کرے، تو اُس کو مشورہ دینے میں اُس کی خیرخواہی کا لحاظ کرو) جب اُس کو چھینک آئے اور الحمدللہ کہے، تو اس کے جواب میں یرحمک اللہ کہو، جب وہ بیمار ہوجائے تو اُس کی عیادت کرو، جب وہ مرجائے تو اُس کے جنازے میں شرکت کرو''۔

مسلمان کے ساتھ خیرخواہی:

ہر مسلمان کے ساتھ خواہ وہ موجود ہو یا نہ ہو، جانا پہچانا ہو یا اَنجانا، ہر ایک کے ساتھ خیرخواہی کرنا دین کا حصہ ہے، مسلمان کا حق ہے، اگر کوئی مسلمان کسی سے خیرخواہی کا طلب گار ہوتا ہے، تو خیرخواہی واجب کے درجے میں ہوجاتی ہے، اگر کوئی کام اُس کے مناسب وبہتر ہو، تو اُس کی ترغیب دینا، کوئی کام اُس کے لیے نقصان دہ ہو، تو اُس کو نقصان سے بچانے کی فکر کرنا، یہ مسلمان کے ساتھ خیرخواہی ہے۔

جب کوئی مسلمان اپنی ذات، کاروبار، ملازمت، کسی چیز کی خرید وفروخت، رشتۂ نکاح، طلاق وخلع یا کسی بھی مسئلے میں آپ پر اعتماد کرتے ہوئے آپ سے مشورہ کرے، تو اُس وقت اس کو پوری امانت داری کے ساتھ اس کے مناسب حال مشورہ دینا، نقصان سے بچانے کی فکر کرنا، اُس حالت میں اپنے لیے جو فیصلہ لے سکتے ہیں، وہ فیصلہ اُس کے لیے کرنا لازم ہوجاتا ہے، جو بھلائیاں ہیں، اگر اس سلسلے میں کوئی کوتاہی کرتا ہے، تو یہ مسلمان کے ساتھ خیرخواہی کے منافی اور خیانت ہے، اگر کسی مسئلے میں دھوکہ دینے کی کوشش کی جائے، تو علماء نے اس کو نفاق قرار دیا ہے۔

ہر مسلمان کے ساتھ ''خیرخواہی'' کرنا، اس خیرخواہی کے مفہوم میں بڑی وسعت ہے، حقیقت تو یہ ہے کہ ''ہر مسلمان کی خیرخواہی'' یہ ایک ایسا عملِ خیر ہے کہ اگر ہر مسلمان اس تعلیمِ نبوت کو حرزِ جان بنا کر اس پر عمل شروع

کردے، تو ایک مسلم معاشرے کی کایا پلٹ جائے اور ''مسلم معاشرہ'' راحت وسکون اور اطمینان کا ایک ایسا گہوارہ بن جائے کہ دنیا ہی میں جنت کے سکون واطمینان کا جلوہ نظر آنے لگے۔

جب ہر مسلمان اپنے اوپر لازم کرلے کہ میں ہر مسلمان کی خیر خواہی کروں گا، ہر ایک کی صلاح وفلاح اور نفع رسانی و بھلائی کے سوا نہ کچھ کروں گا، نہ کچھ سوچوں گا، تو نہ کوئی مسلمان کسی مسلمان کے ساتھ خیانت کرے گا، نہ چغلی، نہ غیبت نہ بہتان تراشی کا مرتکب ہوگا، نہ کسی طرح کا ظلم کرے گا، وہ سب کا بھلا چاہے گا اور سب کے ساتھ بھلائی کرے گا، تو مسلم معاشرہ ہر قسم کے مکروفریب، نقصان وضرر، ظلم وستم، بغض وحسد، عناد ونفاق، بدخواہی وایذارسانی وغیرہ تمام اخلاقِ رذیلہ سے پاک وصاف ہوجائے گا۔

سب سے زیادہ خیر خواہ حضراتِ انبیاء علیہم السلام:

مخلوق میں سب سے زیادہ خیر خواہ حضراتِ انبیاء علیہم السلام ہیں، جنہوں نے اپنی امتوں کے ساتھ بے پناہ خیر خواہی کا معاملہ فرمایا ہے، ﴿أَنّیْ اَنْصَحَ لَکُمْ﴾، ﴿اِنِّیْ اَنَا لَکُمْ نَاصِحٌ اَمِیْنٌ﴾ وغیرہ کلمات سے امت کے سامنے اپنا ناصح ہونا بیان فرمایا، حضراتِ انبیاء علیہم السلام کو اپنی امتوں سے ہم دردی وشفقت ہوتی ہے، اِس وجہ سے وہ لوگوں کو ایسی باتوں کی تعلیم دیتے ہیں جن میں ان کی دنیا وآخرت کی بھلائی اور کامیابی ہوتی ہے۔

امت اپنے خیر خواہ اور ناصح لوگوں سے غافل ہوتی ہے، ان کی ہدایات اور تعلیمات سے روگردانی کرتی ہے، تو بھی حضراتِ انبیاء علیہم السلام اپنی خیر خواہی کے وافر جذبات اور دلی تڑپ کے ساتھ ان کے گھروں پر رات اور دن جا کر محض ان کی خیر خواہی کی بنیاد پر محنت کرتے ہیں اور امت کو سمجھاتے ہیں کہ ہماری محنت کی مزدوری اور بدلہ اللہ دیں گے، ہم بے غرض ہوکر تمہارے دروازوں پر آکر تمہاری تھوڑیاں پکڑ کر تمہارے ساتھ بھلائی چاہتے ہیں اور جنت کی دعوت اور جہنم سے بچانے کی فکر کرتے ہیں، انسانوں کے ساتھ خیر خواہی حضراتِ انبیاء علیہم السلام کی خاص صفت ہے، اسی صفت کو عام امتی کو اپنانے کی ترغیب دی گئی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خیر خواہی کی ایک عمدہ مثال:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری اور لوگوں کی مثال اُس شخص کی سی ہے، جو آگ روشن کرے، جب آگ نے اپنے آس پاس کی چیزوں کو روشن کردیا، تو چاروں جانب سے پروانے اور یہ جانور (جو روشنی کا رُخ کرتے ہیں) آگ میں آکر گرنا چاہتے ہیں، آگ روشن کرنے والا آدمی ان پروانوں کو روک رہا ہے، پھر بھی وہ

اس پر غالب آرہے ہیں (اس کے قابو سے باہر ہورہے ہیں، اسی طرح تم نفسانی خواہشات، معاصی اور محرمات کا ارتکاب کرتے ہوئے جہنم کی آگ میں کودنا چاہتے ہو) میں تمہاری کمر پکڑ پکڑ کر تمہیں روک رہا ہوں (معاصی، کفر اور شرک سے) پھر بھی تم مجھ پر غالب آرہے ہو۔ (بخاری، کتاب الرقاق، باب الانتهاء عن المعاصي: ٦٤٨٣)

مسلم شریف کی روایت میں یہ اضافہ ہے: میں تمہاری کمر پکڑ کر کہہ رہا ہوں کہ آگ سے دُور ہٹو، آگ سے دُور ہٹو، پھر تم مجھ پر غالب آرہے ہو۔ (مسلم، كتاب الفضائل، باب شفقة صلّى اللّٰه عليه وسلم على أمته ومبالغته في تحذيرهم ممايضرهم: ٢٢٨٤)

إِنَّمَا مِثلي ومثل النَّاس كَمَثَلِ رَجُلٍ اسْتَوْقَدَ نَارًا فَلَمَّا أَضَاءَ تْ مَاحَوْلَهُ جَعَلَ الْفَرَاشُ وَهٰذِهِ الدَّوَابُّ الَّتِي تَقَعُ فِي النَّارِ يَقَعْنَ فِيْهَا وَجَعَل يحجزهن ويغلبنه فيقتحمن فيهَا فأَنَا آخِذٌ بحُجَزِكم عن النارِ وأنتم يقتحمون فيها. هٰذه رواية البخاريّ ولمسلم نحوها، وقال في آخرها: "فَذٰلِكَ مَثَلِي وَمَثَلُكُمْ أَنَا آخِذٌ بِحُجَزِكُمْ عَنِ النَّارِ: هَلُمَّ عَنِ النَّارِ هَلُمَّ عَنِ النَّارِ فَتَغْلِبُوْنِي تَقَحَّمُوْنَ فِيْهَا".

حضراتِ انبیاء علیہم السلام کی خیر خواہی کے چند نمونے

﴿اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّیْ وَاَنْصَحُ لَكُمْ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَالَاتَعْلَمُوْنَ○﴾ (الاعراف:٦٢)

﴿اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّیْ وَاَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ اَمِیْنٌ○﴾ (الاعراف:٦٨)

﴿قَالَ رَبِّ اِنِّیْ دَعَوْتُ قَوْمِیْ لَیْلًا وَّنَهَارًا ○ فَلَمْ یَزِدْهُمْ دُعَائِیْ اِلَّافِرَارًا ○ وَاِنِّیْ كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوْآ اَصَابِعَهُمْ فِیْ اٰذَانِهِمْ وَاسْتَغْشَوْا ثِیَابَهُمْ وَاَصَرُّوْا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا ○ ثُمَّ اِنِّیْ دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا ○ ثُمَّ اِنِّیْ اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَاَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَارًا ○ فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اِنَّهُ كَانَ غَفَّارًا○﴾ (سورۃ النوح:٥-١٠)

﴿قَالَ یٰقَوْمِ اَرَاَیْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰی بَیِّنَةٍ مِنْ رَّبِّیْ وَرَزَقَنِیْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا، وَمَآ اُرِیْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰی مَآاَنْهٰكُمْ عَنْهُ اِنْ اُرِیْدُ اِلَّاالْاِصْلَاحَ مَااسْتَطَعْتُ وَمَاتَوْفِیْقِیْ اِلَّابِاللّٰهِ عَلَیْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَیْهِ اُنِیْبُ ○ وَیٰقَوْمِ لَایَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِیْ اَنْ یُّصِیْبَكُمْ مِثْلُ مَآاَصَابَ قَوْمَ نُوْحٍ اَوْقَوْمَ هُوْدٍ اَوْقَوْمَ صَالِحٍ وَمَاقَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِیْدٍ ○ وَاسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْآ اِلَیْهِ اِنَّ رَبِّیْ رَحِیْمٌ وَدُوْدٌ○﴾ (سورۂ ہود:٨٨-٩٠)

خیر خواہی اور حضرت جریر رضی اللہ عنہ کی استقامت:

عَنْ قَيْسٍ سَمِعْتُ جَرِيْرًا رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ، يَقُوْلُ: بَايَعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى شَهَادَةِ أَنْ لَّاإِلٰهَ إِلَّااللّٰهُ، وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ، وَاِقَامِ الصَّلَاةِ، وَاِيْتَاءِ الزَّكَاةِ، وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ، وَالنُّصْحِ لِكُلِّ مُسْلِمٍ. (بخاری، کتاب البیوع، باب هل یبیع حاضر لباد: ۲۱۵۷)

''حضرت جریر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک پر اللہ کی وحدانیت، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت، اقامتِ صلاۃ، زکاۃ کی ادائیگی، سمع وطاعت اور ہر مسلمان کے ساتھ خیر خواہی کا معاملہ کرنے پر بیعت کی ہے''۔

حضرت جریر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو عہد کیا تھا ساری زندگی اُس عہد کے پابند رہے، مسلمانوں کا اجتماعی معاملہ ہو یا کسی مسلمان کا انفرادی مسئلہ، ہر موقع پر مسلمان کے ساتھ خیر خواہی کو اپنے اوپر لازم کرلیا تھا۔

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ (جو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی جانب سے کوفے کے امیر تھے) کا انتقال ہوگیا، (جب کسی سرکاری ذمہ دار اور امیر کا انتقال ہوتا ہے، تو عوام میں بغاوت، انتشار اور خانہ جنگی کے خطرات پیدا ہوتے ہیں، امن وامان ختم ہوجاتا ہے، کوفے میں اِس طرح کے حالات بکثرت پیش آتے تھے؛ اِس لیے حضرت جریر رضی اللہ عنہ نے کوفہ میں امن وامان کے باقی رکھنے اور عوام کو فتنوں سے بچانے کی فکر سے) مسجد کے منبر پر کھڑے ہوکر اللہ کی حمد وثنا بیان کی اور فرمایا: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اسلام قبول کرنے کے لیے حاضر ہوا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے لیے شرط لگائی کہ میں ہر مسلمان کے ساتھ خیر خواہی کروں گا، اس مسجد کے رب قسم! میں نے اس شرط کو قبول کرتے ہوئے بیعت کی ہے (میں اس عہد وبیعت کو نبھانے کی سعا کرتا ہوں؛ اِس لیے) میں نے تمہارے ساتھ خیر خواہی کی ہے (امن وسلامتی کو برقرار رکھنے کی تلقین کی ہے) یہ باتیں کہہ کر منبر سے نیچے اُتر آئے۔ (بخاري، كتاب الإيمان، باب: الدين النصيحة:۵۸)

حضرت جریر رضی اللہ عنہ کی خیر خواہی کا ایک دلچسپ واقعہ:

حضرت جریر رضی اللہ عنہ نے اپنے آزاد کردہ غلام سے فرمایا کہ: تین سو درہم میں ایک گھوڑا خرید کر لاؤ، غلام بازار گیا، تین سو درہم میں گھوڑا خرید کر گھوڑے کے مالک کو ساتھ لے آیا؛ تاکہ حضرت جریر رضی اللہ عنہ مالک کو قیمت ادا کریں، حضرت جریر رضی اللہ عنہ نے گھوڑا دیکھ کر مالک سے فرمایا: تمہارا گھوڑا تین سو درہم سے

زیادہ قیمت کا ہے، کیا تم اس کو چار سو درہم میں فروخت کرو گے؟ اس نے خوش ہوکر کہا: ضرور، پھر حضرت جریر رضی اللہ عنہ نے کہا: تمہارا گھوڑا چار سو درہم سے زیادہ قیمت کا ہے، کیا تم پانچ سو درہم میں فروخت کرو گے؟ اسی طرح قیمت بڑھاتے بڑھاتے آٹھ سو درہم تک لے گئے اور آٹھ سو درہم میں گھوڑا خریدا، کسی نے عرض کیا: حضرت! گھوڑا آپ کو تین سو روپئے میں مل رہا تھا، آپ نے آٹھ سو روپئے میں کیوں خریدا؟

حضرت جریر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر ہر مسلمان کے ساتھ بھلائی وخیر خواہی کرنے پر بیعت کی ہے (میں اس عہد وبیعت کا پابند ہوں)، اس شخص کا گھوڑا میرے نزدیک تین سو درہم سے زیادہ قیمت کا تھا، اگر میں تین سو درہم میں خریدتا، تو یہ مسلمان کے ساتھ خیر خواہی کے خلاف ہوتا، اس گھوڑے کی واقعی جو قیمت تھی میں نے وہ ادا کی ہے۔

(طبراني بحواله فتح الباري، كتاب الإيمان، باب: الدين النصيحة: ٥٨)

ان احادیثِ مبارکہ سے معلوم ہوا کہ دینِ اسلام فقط عبادات، ذکر واذکار یا وظائف کا نام نہیں؛ بلکہ بندوں کے حقوق، ان کے ساتھ خیر خواہی، ان کے لیے خیر اور بھلائی کا چاہنا، یہ بھی دینِ اسلام کا حصہ ہے، لوگوں کی تذلیل کرنا یا اُن کے نقصان کے درپے ہونا یا اُن کے ساتھ بدخواہی کا معاملہ رکھنا ایمان کی شان کے خلاف ہے۔

قرآنِ مجید میں دو خیر خواہ مردِ مؤمن کا ذکرِ خیر:

اللہ تعالیٰ نے سورۂ یٰسین میں ایک مردِ صالح کا ذکر فرمایا ہے، جس کا نام حبیب نجار تھا، بستی کے ایک کنارے عبادت میں مشغول رہتا اور حلال روزی حاصل کرتا تھا، شہر انطاکیہ (کما قال المفسرون) کی طرف جو پیغمبر یا پیغمبر کے قاصدین آئے تھے، اُن کی دعوت پر دینِ حق کو قبول کرلیا تھا، جب حبیب نجار کو اطلاع ہوئی کہ بستی والے ان اللہ کے نیک بندوں کو دھمکیاں دے رہے ہیں، شہر سے نکالنے کی تدبیر کررہے ہیں، تو ان مرسلین کی تائید وحمایت اور اپنی قومِ مکذبین کی نصیحت وفہمائش کے لیے دوڑتا ہوا آیا، مکذبین کے شر سے مرسلین کو بچانے اور اپنی قوم کی خیر خواہی اور ہدایت کے لیے اس نے بڑے درد ورنج کے ساتھ قوم کو خطاب کیا، قوم فرنے اس رجلِ مؤمن کو بے دردی کے ساتھ شہید کردیا، اللہ نے شہادت کے فوراً بعد اس رجلِ مؤمن کو جنت میں داخل فرمادیا جیسا کہ شہداء کے ساتھ معاملہ کیا جاتا ہے، اس وقت بھی اس مردِ مؤمن نے یہ تمنا کی کہ کاش! میری قوم کو میرے اکرام، اعزاز اور انعام کی اطلاع ہوجاتی، (تو شاید میری قوم مؤمن بن جاتی) یہ ساری باتیں اس مردِ مؤمن نے ان مرسلین کی تائید وحمایت اور اپنی خیر خواہی میں کی ہے، اسی خیر خواہی کے نتیجے میں ایک گم نام

سماجی اعتبار سے کمزور مردِ مؤمن کا تذکرہ اللہ نے اپنی ابدی وآفاقی کتاب میں فرمادیا۔

اللہ تعالیٰ نے سورۂ غافر میں تقریباً اٹھارہ آیتوں میں ایک رجلِ مؤمن کا ذکر فرمایا ہے، جو فرعون کے خاندان سے تھا، خفیہ طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لا چکا تھا، اسی مردِ مؤمن کی نسبت سے ''سورۃ الغافر'' کا دوسرا نام ''سورۂ مؤمن'' ہے، جب موسیٰ علیہ السلام نے فرعون اور آلِ فرعون کو دین کی دعوت دی، فرعون نے تکبر وغرور سے چُور ہوکر دوسری مرتبہ بنی اسرائیل کے بچوں کو ذبح کرنے اور بچیوں کو زندہ رکھنے کا حکم صادر کیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قتل کرنے کا ارادہ کیا، تو اس رجلِ مؤمن نے بڑی فکرمندی اور دل سوزی کے ساتھ خیر خواہانہ اور محبت آمیز لب ولہجے، دل کش ودل فریب اسلوبِ بیان میں فرعون اور اس کی قوم کو سمجھانے کی کوشش کی، پچھلی اقوام کے حالات کا ذکر کیا، دنیا کی فنائیت اور آخرت کی بقا کو بیان کیا، غرض مختلف اسلوب سے ہمت وجرأت کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حمایت اور اپنی قوم کی خیر خواہی میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی؛ تاکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کی طرف سے پہنچنے والی کسی تکلیف واذیت سے محفوظ رکھا جائے اور فرعون اور اس کی قوم کو ہدایت نصیب ہوجائے، اس رجلِ مؤمن نے تھک کر آخر میں یوں کہا:

﴿فَسَتَذْكُرُوْنَ مَآ اَقُوْلُ لَكُمْ وَاُفَوِّضُ اَمْرِیْ اِلَى اللّٰهِ، اِنَّ اللّٰهَ بَصِيْرٌ بِالْعِبَادِ○﴾

میرا اور تمہارا معاملہ بھی عجیب ہے، میں چاہتا ہوں کہ تم کو ایمان کے راستے پر لگا کر خدا کے عذاب سے نجات دلاؤں اور تمہاری کوشش یہ ہے کہ اپنے ساتھ مجھے بھی دوزخ کی آگ میں دھکیل دو، ایک طرف س ایسی دشمنی اور دوسری جانب سے یہ خیر خواہی.....۔

جب اپنی زیادتیوں کا مزہ چکھو گے، اس وقت میری نصیحت کو یاد کرو گے کہ ہاں ایک مردِ خدا جو ہم کو سمجھایا کرتا تھا، وہ ٹھیک کہتا تھا؛ لیکن اس وقت یاد کرکے پشیمان ہونے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا، میں خدا کی حجت تام کر چکا اور نصیحت کی بات سمجھا چکا، تم نہیں مانتے، تو میرا تم سے کچھ مطلب نہیں، اب میں اپنے کو بالکلیہ خدا کے سپرد کرتا ہوں، اسی پر میرا بھروسہ ہے، تم اگر مجھے ستانا چاہو گے، تو وہ ہی خدا میرا حامی وناصر ہے، سب بندے اس کی نگاہ میں ہیں، وہ میرا اور تمہارا دونوں کا معاملہ دیکھ رہا ہے، کسی کی کوئی حرکت اس پر پوشیدہ نہیں، ایک مؤمن قانت کا کام یہ ہے کہ اپنی امکانی سعی کر چکنے بعد نتیجہ کو خدا کے سپرد کرے۔ (فوائدِ عثمانیؒ مع اختصار)

مذکورہ دونوں مردِ مؤمن نہ پیغمبر تھے، نہ پیغمبر کے حواری میں شامل، وہ تو صرف عام مؤمن تھے، اپنی قوم کی خیر خواہی کی بنا پر ان کو شہید کردیا گیا، اللہ رب العزت نے ان دونوں مردِ مؤمن کا ذکرِ خیر اپنے ابدی وآفاقی اور زندہ وجاوید کتاب میں ان کی خیر خواہی کی بنیاد پر فرمایا ہے۔

قرآنِ مجید میں خیر خواہ چیونٹی کا ذکر:

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں چیونٹی کا ذکر فرمایا ہے، اس کی بے شمار وجوہات مفسرین نے ذکر کی ہیں، ایک اہم وجہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو اللہ نے جانوروں اور پرندوں وغیرہ کی بولیاں سمجھنے کی جو صلاحیت عطا فرمائی تھی، اُس کا اظہار مقصود ہے، اس کے علاوہ دیگر جوہات بھی قرآن کی آیات سے ثابت ہوتی ہیں، ایک وجہ مفسرین نے یہ بھی بتائی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو چیونٹی کی گفتگو سے خوشی ہوئی، ہنسی آئی، اس کی احتیاط، اس کی حسنِ تدبیر، حسنِ تعبیر اور اپنی قوم کی خیر خواہی کی وجہ سے، اللہ نے ایک حقیر و معمولی حشرات الارذ کا ذکر قرآنِ پاک میں اس کی خیر خواہی کی وجہ سے فرمایا ہے۔

قَالَتْ نَمْلَةٌ أي رأتهم متوجّهين إلٰى واديها يٰٓاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسَاكِنَكُمْ لَايَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ وَهُمْ لَايَشْعُرُوْنَ ○ أي بمكانكم فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا أي تعجبا من حذرها واهتدائها إلٰى تدبير مصالحها ومصالح بني نوعها وسرورا بشهوة حاله وحال جنوده في باب التقوىٰ والشفقة. (تفسیرالقاسمی: النمل، روح البیان، تفسیر السعدی)

اکابرِ دیوبند کے علوم ومعارف

پڑھتے جائیں محظوظ ہوتے جائیں

(حضرت اقدس مولانا خلیل احمد سہارنپوری قدس سرہٗ کے علوم ومعارف)

ماخوذ از: تذکرۃ الخلیل

ازقلم: مولانا محمد اویس صاحب رشادی، استاذ دارالعلوم شاہ ولی اللہ بنگلور

حدیث دانی کی شرط:

حدیث دانی محض الفاظ کے ترجمہ کا نام نہیں؛ بلکہ اس کے لیے تمام علوم وفنون کی مہارت کے بعد ایک وہبی حذاقت درکار ہے، جس کو تفقہ کہتے ہیں اور اسی نعمتِ الٰہیہ نے فقہ کو شرحِ حدیث بنا کر دریائے ناپید کنار بنا دیا کہ صدہا ضخیم کتابیں مدون ہوچکیں اور جب دیکھو اخلاف کے لیے اس کی ضرورت قائم وللہ در القائل۔ ؎

گر مصور صورت آں داستاں خواہد کشید
ایک حیرانم کہ نازش را چساں خواہد کشید

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ لفظ سیّدنا کے استعمال پر قاضی مدینہ سے مدلل گفتگو:

آپ روضۂ مسجد نبوی میں حجاز کے قاضی القضاۃ امیر ابن بلیہد کے پاس بیٹھے ہوئے تھے اور سلطان عبدالعزیز ان کے برابر، اس زمانہ میں جو شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نامِ مبارک کے ساتھ لفظ سیّدنا استعمال کرتا نجدی لوگ اُس کو مشرک کہتے اور چار طرف حرمِ نبوی میں یہی صدا کان میں پڑتی تھی، حضرت نے موقع غنیمت پاکر قاضی صاحب سے سوال فرمایا کہ آپ لفظ ''سیّدنا'' سے متعلق کیا فرماتے ہیں؟ قاضی صاحب نے تھوڑی دیر سکوت کیا اور پھر فرمایا کہ حدیث میں کہیں نہیں آیا، حضرت نے فرمایا کہ ہاں! حدیث میں آیا ہے، قاضی صاحب نے ہمہ تن گوش ہوکر حیرت کے ساتھ پوچھا کہ کہاں آیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ ''أنا سیّد ولد آدم ولا فخر'' قاضی صاحب نے کہا ہاں! اِس طرح تو آیا؛ مگر نامِ مبارک کے ساتھ کہیں نہیں آیا، حضرت نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے نامِ مبارک کے ساتھ تعالیٰ جو لگاتے ہیں کہیں قرآن شریف میں آیا ہے؟ قاضی صاحب

نے کہا نہیں، قرآن شریف میں کہیں نہیں آیا، حضرت نے فرمایا کہ کون کہا کرتا ہے کہ ہمارے نام کے ساتھ تعظیمی الفاظ استعمال کرو؛ بلکہ ایک جگہ حدیث میں آ گیا کافی ہے۔

سلطان اس مکالمہ کو سن رہے تھے، اب انھوں نے قاضی صاحب سے سوال کیا کہ کہیں اس کی ممانعت آئی ہے؟ قاضی صاحب نے جواب دیا ممانعت نہیں آئی، سلطان نے فرمایا ایک جگہ آ گیا اور ممانعت کہیں نہیں آئی، تو اس پر تشدد کیوں کیا جاتا ہے؟ حضرت کی قاضی صاحب اور سلطان سے پہلی ملاقات تھی، جس میں حضرت نے اپنا حق ادا کیا، اگلے دن نجدیوں میں حضرت کی گفتگو کا شور برپا رہا اور پھر مشرک کی صدا کبھی کان میں نہ آئی۔

بدائع الصنائع کا مطالعہ:

اوقاتِ فراغ میں حضرت بدائع کو اکثر دیکھا کرتے، بارہا سنا کہ حضرت اس کے مصنّف کو بہت دعائیں دیتے اور فرمایا کرتے کہ واقعی یہ شخص فقیہ تھا اور اللہ تعالیٰ نے اس کو فقہ ہی کے لیے پیدا فرمایا تھا۔

مولوی ظفر احمد نے ایک مرتبہ عرض کیا کہ حضرت! فقہ سے مناسبت پیدا ہونے کی کوئی صورت ارشاد فرمائیں، فرمایا مفتیوں کی عادت یہ ہے کہ صرف استفتاء کے وقت کتابیں دیکھتے ہیں، اس سے کام نہیں چلتا اور جواب میں بہت غلطی ہو جاتی ہے؛ کیوں کہ اس وقت جلدی میں ایک جگہ کو دیکھ کر جواب لکھ دیتے ہیں؛ حالاں کہ دوسرے مقام میں اس مسئلہ کی تفصیل معلوم ہوتی ہے، جس سے اس واقعہ مسئولہ کا حکم بدل جاتا ہے، پس فقہ سے مناسبت پیدا کرنے کے لیے شامی اور بدائع کو بالاستیعاب دیکھنا چاہیے۔

حرم میں جمعہ کی اذانوں کے مابین سنتوں کے لیے وقفہ:

ایک مرتبہ قاضی ابنِ بلیہد آپ کو ہاتھ پکڑ کر اپنی قیام گاہ پر لے گئے، مختلف باتیں ہوتی رہیں، جب انبساط تام ہو گیا تو حضرت نے فرمایا: قاضی صاحب! مسجد مبارک میں جمعہ کی پہلی اذان کے بعد متصل ہی دوسری اذان خطبہ کی شروع ہو کر خطبہ شروع ہو جاتا ہے، جمعہ کی سنتوں کے پڑھنے کا وقت ہی نہیں ملتا، مالکی اور حنبلی حضرات ان سنتوں کو ضروری نہیں سمجھتے؛ مگر ہم احناف کے نزدیک تو مؤکدہ ہیں، قاضی صاحب نے یہ سُن کر حضرت سے پوچھا کہ کس قدر فصل کافی ہے؟ حضرت نے فرمایا دس منٹ، قاضی صاحب نے نائب الحرام کو جو اس وقت اتفاق سے موجود تھے حکم دیا کہ پہلی اور دوسری اذان میں ۱۰ منٹ کا فصل کیا جائے، اتفاق سے اگلے ہی روز جمعہ تھا اور نائب الحرام اس حکم کو باقاعدہ جاری نہ کر سکے؛ مگر جب پہلی اذان ہو چکی تو خطیب کو منبر پر جانے سے ذرا ٹھہرائے رکھا اور حضرت کو دیکھتے رہے، جب حضرت چار سنتیں حسبِ عادت پورے اطمینان سے ادا کر لیں، تب خطیب کو

خطبہ کے لیے روانہ کیا اور دوسرے جمعہ سے باقاعدہ اس حکم کا اجراء ہوگیا، سنتیں پڑھنے والے بڑے سکون سے قبل الخطبہ سنتیں پڑھنے لگے۔

اختلافی صورت میں احوط قابلِ ترجیح ہے:

عمل کے لیے اختلافی روایات میں ہمیشہ آپ احوط صورت کو ترجیح دیتے تھے؛ چناں چہ جب میرے بھتیجے نے قرآنِ مجید ختم کیا، عمر ۱۴ رسال کی تھی، میں نے چاہا رواج کے موافق فقہاء مجوزین کی روایت پر اُس کا قرآنِ مجید تراویح میں سنوں؛ مگر حضرت نے تحریر فرمایا عالمگیریہ میں ہے: ''**وأمّا الصبي العاقل في التراويح والنوافل المطلقة يجوز عند بعضهم، ولايجوز عندعامتهم، كذا في محيط السرخسي**'' جب کہ اکثر مشائخ عدمِ جوازِ امامت کا حکم فرمارہے ہیں، تو مناسب نہیں ہے، ایسی عبادت کے اندر جو سال بھر میں ایک ہی دفعہ آتی ہے، قولِ ضعیف پر عمل کر کے راجح قول کے بموجب ضائع کیا جائے؛ لہٰذا اس سال بچہ کا قرآن نوافل میں سُن لیجیے، سالِ آئندہ میں اللہ خیر رکھے تو تراویح میں سُن لیجیے گا، فقط والسلام۔

حاجی شیخ رشید احمد صاحب کے بچوں کے ختم قرآن شریف پر تشریف لائے تو اپنی تراویح علیٰحدہ پڑھیں، اُن کی اقتدا نہیں کی۔

جھینگا مچھلی:

جھینگا مچھلی کے متعلق بھی آپ کی رائے تھی کہ مچھلی نام پڑ گیا، حقیقت میں وہ مچھلی نہیں کہ اُس کے گلپھڑے نہیں ہوتے؛ لہٰذا آپ اُس کو دریائی جانور سمجھتے اور حلّت کا فتویٰ نہیں دیتے تھے۔

شافعی امام کے پیچھے نماز اور دیگر مذاہب کی رعایت کی درخواست:

سلطان کی تشریف آوری سے قبل ایک قصہ یہ پیش آچکا تھا کہ شافعی امام نے صبح کی نماز میں سجدۂ تلاوت پڑھ کر روع کر دیا کہ یہ بھی قائم مقام سجدہ کے ہے، سلام پھیرنے کے بعد امام صاحب سے فرمایا کہ یہ سجدہ ہم حنفیوں کے یہاں واجب ہے اور رکوع سے جب تک اس کو قائم مقام سجدہ بنانے کی نیت نہ کرے ادا نہیں ہوتا اور بہتوں کو معلوم بھی نہیں کہ یہاں سجدہ کرنا ہے اور یہ آیتِ سجدہ ہے؛ لہٰذا احناف کے مذہب کی رعایت آپ پر واجب ہے، امام نے روکھا جواب دے دیا کہ ہم پر کسی کے مذہب کی رعایت واجب نہیں، ہم اپنے مذہب کے موافق عمل کیں گے۔

حضرت نے فرمایا: ایسا ہے تو آپ کے پیچھے ہماری نماز نہیں ہوتی اور حضرت نے اعلان فرمادیا کہ جس شخص نے رکوع میں سجدہ کی نیت نہ کی ہو وہ اپنی نماز دوبارہ پڑھے؛ چناں چہ بہتوں نے اپنی نمازیں لوٹائیں، اس کے بعد حضرت نے مدرسہ میں اپنی علیٰحدہ جماعت کا اہتمام کرلیا، حکومت کو اِس کی خبر ہوئی تو امام سے اس پر بازپُرس کی اور سوءِ ادب پر زجر کیا اور یہ الفاظ کہے کہ: حضرت کے مقابلہ میں تمہارے علم کی کیا حقیقت ہے؟ اس کے بعد تمام ائمہ کے نام حکم جاری ہوا کہ جملہ مذاہب کی رعایت کرتے ہوئے نماز پڑھائیں اور حضرت سے معذرت کی اور اطمینان دلایا کہ آئندہ ایسا نہ ہوگا؛ چناں چہ آپ پھر حرم شریف میں جانے لگے۔

Sada e Haq Islamic Portal
J P Nagar Bengalore
96207 95460

صدائے حق اسلامک پورٹل
جے پی نگر بنگلور
96207 95460

Ref No ...034.....

Date 9/8/2023

حادثہ فاجعہ

ہمارے مجلہ ''صدائے حق بنگلور'' کے کرم فرما حضرت مولانا مفتی محمد اسجد صاحب قاسمی ندوی دامت برکاتہم، مہتمم وشیخ الحدیث مدرسہ امدادیہ مرادآباد کی والدۂ محترمہ کا انتقال یقیناً ہم خدامِ ''صدائے حق (بنگلور)'' کے لیے نہایت تکلیف دہ ہے، ہم خدام حضرت والا اور اُن کے اہلِ خانہ کی خدمت میں تعزیتِ مسنونہ پیش کرتے ہوئے دست بدعا ہیں کہ: اللہ تعالیٰ مرحومہ کی مغفرت فرمائے، غریقِ رحمت کرے، درجات کو بلند فرمائے اور تمام لواحقین بالخصوص حضرت والا کو صبرِ جمیل عطا فرمائے، آمین ثم آمین یارب العالمین

منجانب: مجلس صدائے حق بنگلور